Urdu Literature Reader.

ادیب اردو

ADEEB-I-URDU

SELECTED AND ANNOTATED

BY

MAULVI MUHAMMAD ISMAIL, K.S.,

AUTHOR OF

KULLIAT-I-ISMAIL, &c.,

Late Persian Teacher, Central Normal School, Agra.

PRESCRIBED AS TEXT-BOOK

FOR

CLASS V & SECOND VERNACULAR FOR CLASS VII

OF THE

VERNACULAR SCHOOLS

BY ORDER OF

The Director of Public Instruction, United Provinces.

THE NEWUL KISHORE PRESS,

Hazratganj, LUCKNOW.

14th Edition] [5,000

Copyright Reserved.]

[*Price As. 8 per copy.*

فہرست مضامین ادیب اردو

حصۂ نثر

حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادیبِ اُردو

حصۂ نثر

از شمس العلما خان بہادر مولوی ذکاء اللہ

کوئن وکٹوریا کی الماسی جوبلی،

دُنیا میں شاید چند مرد بادشاہ ایسے ہوئے ہوں، مگر کوئی بانو ایسی بادشاہ نہیں ہوئی کہ جس کی فرماں رہی کی مُدّت ایسی دراز ہوئی ہو جیسی کہ ملکۂ معظمہ کی فرماں روائی کی مُدّت دراز ہوئی ہے، اور یہ بات تو کسی مرد بادشاہ اور بانو بادشاہ کو حاصل ہی نہیں ہوئی کہ اُس کی قلمرو میں دُنیا کے اندر چاروں طرف رعیّت ہر رنگ اور ہر مذہب کی مختلف الاغراض ہو، اور باہم رقابت و عداوت رکھتی ہو، اور اُس کا غیر قوموں سے صنعت و حرفت و محنت و تجارت میں مُقابلہ ہو، مگر وہ اپنے بادشاہ کی فرماں برداری و نیک خواہی و وفاداری میں یک دل و یک جہت مُتّفق ہو، اور اُسکے عہدِ سلطنت میں رعیّت کی

جسمانی اور روحانی ترقّی و بہبودی کے لئے جتنے اسباب و اثر مؤیّد و معاون ہوں اُن میں سے کبھی کسی ایک کے زور میں کمی نہ آتی ہو۔ اس کا سبب صرف حضرت ملکۂ معظّمہ کی خوش خوئی اور پاک باطنی و کونسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ ہے، اس کے سوا کسی اور سبب کا تبلانا مشکل ہے۔

۱۸۸۷ء کے جشن جوبلی سے لوگوں کو یہ فکر تھا کہ اگر ۱۸۹۷ء میں ڈائمنڈ جوبلی کا جشن ہو تو وہ کس طرح ہونا چاہیئے۔ پہلے ہی ۱۸۹۰ء سے سب کی توجّہ اس طرف ہوئی کہ انگلستان کے کُل بادشاہوں سے زیادہ تر عزیز شہنشاہ بانو کی ساٹھویں سال کی سلطنت کا جشن ضرور ہونا چاہیئے، مگر اس میں اختلافِ آرا تھا کہ وہ کیونکر ہونا چاہیئے۔ لیکن اس خیال میں سب مُتّفق تھے کہ اس جشن میں ملکۂ معظّمہ ہم میں آئیں اور ہماری مُبارک، سلامت، خوش سُنیں، یہ خیال تمام اور تدابیر و تجاویز کا مرکز تھا۔ ملکہ نے اس بات کو منظور فرمایا اور مارچ ۱۸۹۷ء میں اپنا یہ حکم مشتہر فرمایا کہ "وہ شاہانہ تزک و احتشام سے سینٹ پال کے گرجا میں جاکر اپنے پروردگار کا سجدۂ شکر ادا کریں گی کہ اُس نے اپنے فضل و کرم سے اتنی مدّت دراز تک اُن کی سلطنت پر بہت سی برکتیں اور رحمتیں نازل کیں"

حضرت عُلیا کی سلطنت کے ساٹھویں سال میں قومی فخر، قومی عزّت ملکی محبّت، قلمرو کی افزونی رعیّت کی یگانگی نے جو خاص اسی سلطنت کا حصّہ ہے

اپنا وہ جلوہ دکھایا کہ تاریخ میں یادگار روزگار رہے گا۔ اور اس جوبلی کے جشن کے آگے ۱۸۸۷ء کے جشن جوبلی کا حال ایسا ہوگیا جیسا کہ چاند کی چاندنی کا سورج کی دھوپ کے روبرو ہوتا ہے۔

اس سے پہلے کہ یہاں جشن کی تیّاریاں ختم کی جائیں، لندن میں چاروں طرف سے آدمیوں کی آمد شروع ہوئی، تمام یورپ کے ملکوں، اور امریکہ سے آدمی آنے لگے۔ بازاروں میں تجارت کا بازار ایسا گرم ہوا اور اُن میں وہ بھیڑ بھاڑ رہنے لگی کہ آدمی کو چلنے کے لئے راستہ مشکل سے ملتا تھا۔ شہر کے ایک حصّہ سے دوسرے حصّہ میں جانا دشوار تھا۔ سب ہوٹلوں کے کمرے ہفتوں پہلے لوگوں نے کرایہ لے لیے جس کے سبب سے ہوٹل کے ملازم اور لیڈیاں مالا مال ہوگئیں، سواری کی گذرگاہ پر جو مکانات باسامان تھے، وہ آدمیوں سے بھر گئے، علاوہ اِس کے گورنمنٹ ہوس کی چھتوں پر اور خالی زمینوں پر نشست گاہیں ایسی رفیع الشان بنائی گئیں کہ اُن کی بلندیوں سے شہر کے سارے بازاروں کے آگے ایسی دیواریں کھڑی ہوگئیں کہ بازار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ بعض گرجاؤں کے آگے وہ ایسی کھڑی ہوئیں کہ اُن کے پیچھے گرجا نظر نہ آتے تھے۔ اِن مصنوعی عارضی مکانوں کی لاگت کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ ایک مکان کے لئے خالی زمین چھ ہزار پونڈ کو خریدی گئی اور سات ہزار پونڈ اُس کی لاگت میں خرچ ہوئے۔ چھ ہفتے تک صدہا بڑھئیوں نے کام کرکے اُس کو

تمام کیا پانچ ہزار کرسیاں اُس کے لئے خریدی گئیں۔ اور لنچن کھانے کا کمرہ ایسا وسیع بنایا گیا کہ اُس میں چار سو آدمی کھانا کھائیں، ایک اور نشست گاہ بنائی گئی جس پر چار ہزار آدمی بیٹھ سکیں۔ ہر نشست میں ایک گنّی سے لے کر پندرہ گنّی تک لاگت لگی۔ اُس کو پانچ ہفتہ میں ایک سو بیس مزدوروں نے روز کام کر کے بنایا۔ اسی طرح دولت کے کمانے کے خیال میں ایک شخص نے اپنی ناکامی سے اپنا دوالا نکالا اُس نے ایک بڑا قیمتی مکان مول لیا اور اُس کو ڈھوا کر نشستوں کے لئے مکان بنوایا جس کے کرایہ سے لاگت نہ وصول ہوئی دوالا نکلا۔ غرض شہر لندن کی ایسی آرایش کی کہ وہ پہلا شہر لندن نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ آرائش گاہ معلوم ہوتا تھا کبھی پہلے ایسی آرایش نہیں ہوئی تھی۔

۲۲۔ جون جوبلی کے جشن کی تاریخ قرار پائی تھی جتنی وہ قریب آتی جاتی تھی اُتنا ہی لندن اپنے لباس کی بھڑک چمکاتا جاتا تھا۔ سواری کی گذرگاہ میں ہر مکان کی سقف و دیوار پر پھریرے پھرّا رہے تھے۔ ۱۱۔ جون کو جشن جوبلی کے دن کا پروگرام مشتہر ہو گیا۔ نہایت احتیاطیں اس بات کے لئے کی گئیں کہ ۲۲۔ جون کی بھیڑ بھاڑ میں کوئی آدمی پس پسا کر مر نہ جائے جیسا کہ زار روس کے جشن تاجپوشی میں بہت سی جانیں تلف ہوئی تھیں نشست کے مصنوعی مکانات کے استحکام کا بار بار طرح طرح سے امتحان کیا جاتا تھا اور حتی الامکان ایسی تدابیر کی جاتی تھیں کہ اس ہنگامہ میں کسی کا بال بیکا نہ ہو۔

بازاروں میں خیر خواہ آدمی آپس میں یہ ذکر کرتے تھے کہ جوبلی کے دِن دیکھیے موسم کیا رنگ دکھاتا ہے، اور موسموں کی پیشین گوئیاں کرنے والے کیا اُمیدیں رکھتے ہیں کہ کوئن کا موسم ہوگا یا کوئی اور موسم؟ جوبلی کے پہلے ہفتے میں طوفان آرہے تھے۔ موسموں کے بیان کا نقشہ جو مشتہر ہوا اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ جشن کے دن بارش ہوگی۔ اور صُبح سے چند گھنٹے پہلے آسمان پر بادل اپنا رنگ دکھا رہے تھے اور اِدھر اُدھر منڈلا رہے تھے اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرکے آسمان کا مُنھ کالا کر رہے تھے کبھی کبھی اِن میں چاند اپنا چہرہ دکھاتا تھا۔ جس پر پانی پھرا ہوا نظر آتا تھا غرض بہت سے قرینے ایسے تھے کہ جشن کے دِن مینھ برسنے کا ظنِّ غالب ہوتا تھا۔ مگر جوبلی کے دِن ملکۂ معظّمہ کی سواری کے وقت آسمان ایسا صاف ہوگیا تھا کہ کبھی ملکۂ معظّمہ کے عہدِ سلطنت میں ایسا نہیں ہوا تھا۔ جس کے سبب سے جشن کا جوبن نکھر گیا۔

ملکۂ معظّمہ نے نہایت دانائی اور دُور اندیشی سے اپنی شاہانہ سواری کی رہگذر ایسی مقرر فرمائی تھی کہ تماشائی اور اُن کی رعیّت کے آدمی زیادہ سے زیادہ اُن کی سواری کی سیر کو دیکھ سکیں۔ جب جشنِ جوبلی میں عید کا دن آیا تو اوپر آسمان پر ابر چھا رہا تھا اور نیچے سارا لندن چہل پہل کر رہا تھا شہر کے نواح سے ہزاروں آدمی آن کر سواری کی راہ گذر میں جمع ہوتے جاتے تھے اُن میں سے جنھوں نے

نشست گاہیں کرایے لے لی تھیں وہ اُن پر بیٹھتے جاتے تھے اور باقی سڑکوں پر دو طرفہ جمتے جاتے تھے۔ جو لوگ سینٹ جیمیس کے پارک میں کھلے میدانوں میں رات کو سوئے تھے وہ اِس عید کے دن سب سے اوّل اپنی شہنشاہ بانو کے دیدار سے مشرف ہونے کے شائق تھے وہ یہ سیر دیکھ رہے تھے کہ اُس قصرِ معلّٰی (بکنگھم) میں جھنڈے کا پھریرا پھرّا رہا ہے جس کے اندر شب کو شہنشاہ بانو نے آرام فرمایا ہے، اُس کے بڑے دروازوں پر ملازمانِ شاہی اِدھر اُدھر جاکر اپنی زرق برق پوشاکوں کے جلوے دکھا رہے ہیں ، اور ممتاز شاہی مہمانوں کی سواریاں قصر میں آرہی ہیں، جو حضرتِ علیا کی سواری کے ہمرکاب جائیں گے۔ پارک کے درختوں کی قطاروں کے نیچے آدمیوں کی بھیڑ بھاڑ بڑھتی جاتی ہے، چیلسی[1] نشین دار، کہنہ سال، بہادر سپاہی جو لڑائیوں میں فرسودہ ہوئے تھے، آہستہ آہستہ چلے آرہے تھے، اُنھیں کی جانفشانی و عرق ریزی سے انگلینڈ کو یہ عروج حاصل ہوا تھا اور اُن کے حال پر یہ عنایت ہوئی تھی کہ دروازوں میں اُن کے آرام سے بیٹھنے کے لئے بنچ بچھا دیے گئے تھے پولیس کے عہدہ دار اِدھر اُدھر انتظام کرتے پھرتے تھے۔

گھنٹے نے سوا نو بجائے "خدا ملکۂ معظّمہ کو سلامت رکھے"، اِس نغمہ کی صدا کان میں آئی، کو لونیوں کی آراستہ پیراستہ سپاہ آنی شروع ہوئی، یہی وہ سپاہ ہے

---

[1] ایک ضلع ہے لندن کے جنوب و مغرب میں ۱۲

جو سمندر اور اُس کے پار برطانیۂ اعظم کی سلطنت کو قائم رکھتی ہے، وہ سینٹ پال کے پاس سڑکوں پر صف بندی کے لئے اس واسطے بھیجی گئی تھی کہ وہ حضرت عُلیا کی سواری کا استقبال اوّل کرے اور اُس کے بعد وہ سواری کے پیچھے ہولے اوّل تا آخر نسبتے دارد۔ پال کی سڑک پر ایک زبردست والنٹیروں کا لشکر نمودار ہوا، لشکریوں کی وردیوں کے رنگوں کی نیرنگی اور بوقلمونی گل بوٹن کا تماشا دکھاتی تھی، یا شگفتہ پھولوں کا ایک گلدستہ معلوم ہوتی تھی کہ کوئی سُرخ ہے اور کوئی نیلی ہے کوئی خاکی ہے۔ پھر ہتھیاروں کا رنگ برنگ ہونا عجب بہار دکھاتا تھا کہ سروں پر خود جگمگاتے ہوئے اور کلاہیں چمکتی ہوئی پہنے ہوئے ہیں، ہاتھوں میں بندوقیں اور نیزے جلوہ نمائی کر رہے ہیں۔ جزیرہ سائی پرنس شمالی بورنیو ہونگ کونگ آسٹریلیا، روڈیشیا کنیڈا اور نٹال کی سپاہ میں غرض ہر مقام کا عسکر موجود تھا، جہاں انگریزی جھنڈے کا پھریرا پھرّاتا اور انگریزی زبان سُنائی دیتی تھی۔ آدمیوں کی پیوستہ صفیں پھر رہی تھیں جو آپس میں ایک دوسرے سے بھائی بھائی کہہ کے باتیں کرتے تھے۔ ان میں یہ رشتہ مندی یا تو ایک بادشاہ کی خیرخواہی کے سبب سے پیدا ہوئی تھی یا اُن کا خون آپس میں مِلتا تھا۔ وہ سینٹ پال کے گرجا کی طرف اُن بہادر لشکروں کو جاتے ہوئے دیکھکر تکبّر کے مارے پھُولے نہ سماتے تھے اور اس خوشی کے مارے اُن کی نبضیں تیز چلتی تھیں کہ شہنشاہ بانو کی سواری کمال تزک و احتشام اور تجمل و جلال

کے ساتھ اُن آراستہ وپیراستہ بازاروں میں آنے والی ہے جس میں آدمی ایسے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں کہ کہیں تِل رکھنے کو جگہ نہیں۔ اِن سپاہیوں کی روانگی کے کچھ دیر بعد حضرت عُلیا کی سواری نے گرجا میں جانے کے لئے قدم اُٹھایا، چیرز کا وہ شور مچا کہ باجوں کی آوازیں اُس کے آگے نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی اوّل گاڑیاں ساری قوموں کے کئی سو عالی جاہ اُمرا و شرفا اور سفیروں کی آئیں جن میں گریس، سنٹرل امریکہ، میکزی کو، برازیل کے خاص سفیر سوار تھے، چینی سفیر چنگ ہن ہو اپنی مشرقی پوشاک بڑی بھڑک دار پہنے ہوئے تھا؟ یونائیٹڈ اسٹیٹ کے خاص سفیر مسٹر وائٹ رِیڈ سب سے زیادہ سادہ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ اِن کے بعد اعلیٰ درجہ کے شاہی عمائد اور ہر سلطنت کے شہزادے اور شہزادیاں اور ملکۂ معظّمہ کے بچّے اور بچّوں کے بچّے اور اُن کی بیوہ بیٹیاں گاڑیوں میں بیٹھی ہوئی آئیں، سولہ گاڑیاں تھیں جِن کو چار چار گھوڑے چلا رہے تھے اِن گھوڑوں کے ساز سونے چاندی کے تھے اور اُن پر چابک سوار لباس زر نگار پہنے ہوئے بیٹھے تھے۔ اُن کے پیچھے شہزادے گھوڑوں پر سوار تھے، جو ملکۂ انگلینڈ کی تعظیم کرنے آئے تھے، اُن کے پیچھے ہندوستان کے سواروں کا رسالہ تھا۔ جن کے گھوڑے بڑے شاندار اور لباس زرنگار تھے۔ پھر کچھ فصل سے سب سے پیچھے سترھویں گاڑی ملکۂ معظّمہ کی تھی یہ عمدہ انتظام کیا تھا کہ ایک تار خانگی ایسا لگا دیا گیا تھا کہ قصرِ بکنگھم میں جس وقت ملکۂ معظمہ سوار ہوں تو ایک ہی وقت

میں کُل دُنیا کے اندر اپنے سوار ہونے کی اطلاع اپنی رعایا کو اس تار کے ذریعہ سے دے دیں۔ سو اُنھوں نے اُس خانگی تار پر جو قصر بکنگھم میں لگایا گیا تھا سنٹرل ٹیلیگراف میں یہ سیدھے سادھے الفاظ بھیجے کہ "مَیں اپنے دِل سے اپنی عزیز رعایا کا شکریہ کرتی ہوں، خدا اُس پر اپنی رحمت اور برکت بھیجے" یہ پیغام دُنیا میں اُن کی کل رعایا کے پاس بجلی کی طرح دوڑ گیا۔

آفتاب نے مُنھ پر نقاب ڈال رکھی تھی اُس نے سوا گیارہ بجے سوار ہونے کی توپ سُن کر اپنے چہرۂ خنداں کو نقاب سے نکال کر مبارک باد دی اور جشن کی گرمی ہنگامہ کو اپنی گرمی سے زیادہ چمکا دیا اور اُس گاڑی کو جس میں ملکۂ معظّمہ اور شہزادی ویلز اور شہزادی کرسچن بیٹھی ہوئی تھیں مجمع انوار بنا دیا جس وقت آٹھ بَرّاق گھوڑوں نے جو سونے کے ساز میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور جن پر چابک سوار زر نگار لباس پہنے بیٹھے تھے حضرت عُلیا کی گاڑی کو چلایا تو بے شمار وفادار رعایا کے حلقوں سے چیرز کا غل شور ہوا۔ سواری کے سامنے کمانڈر انچیف وائیکونٹ ولزلی تھے جن کا سینہ تمغوں سے ستارستان بن رہا تھا اور سواری کے دائیں طرف شہزادہ ویلز اور ڈیوک کناٹ اور بائیں طرف پیرانہ سال ڈیوک کیمبرج اڈیؔ کانگ ملکہ کے تھے پیچھے علم شاہی تھا اُس کے پیچھے سوٹ کے عہدہ دار اور سپاہ تھی۔

ـــــــــــ

لے اڈی کانگ مصاحب ۱۲ سلے دربار ۱۲

جب سواری پاَل مل پرآئی تو بہ نسبت اور مقامات کے یہاں خیر مقدم کی زیادہ دھوم دھام ہوئی پھر شہر کی سرحد ٹیمپل بار پر سواری آئی - یہاں لارڈ میئر منتظر تھا اُس نے وہ شاندار تلوار جس کے قبضے پر موتی لگے ہوئے تھے اور ملکۂ الزبتھ نے دی تھی، شہنشاہ بانو کے آگے پیش کی، پھر سواری لاکوٹ کے پاس آئی جہاں کُل ججوں اور قانون دانوں نے خیر مقدم کیا، یہاں پُرانے شہر کا نشان ہے، چیف مجسٹریٹ نے تلوار پیش کی - ملکۂ معظمہ نے گاڑی میں جھک کر اُس نشان حکومت کو ہاتھ میں لیا اور کچھ آہستہ سے بُول کر اُس کو واپس کیا اور پھر سواری فلیٹ سٹریٹ میں آئی جو پھولوں اور سبز پتّوں سے نہایت آراستہ کیا گیا تھا یہاں سے سواری پہاڑ پر چڑھی جس نے اِس سواری کو وہ رونق آسمانی دیدی جو کبھی اُس کو نصیب نہ ہوئی تھی، یہ قرار پایا تھا کہ سینٹ پال گرجا کے پاس کھلے میدان میں شکر گذاری کی نماز پڑھی جائے گی یہاں کلیسا کے کُل عہدہ دارانِ عظام اور اور سلطنت کے افسرانِ والا مقام ملکۂ معظمہ کے استقبال کے لئے ایستادہ تھے، جس وقت سواری یہاں آئی تو عجیب ایک سماں تھا جو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا - یہ زمزمہ گایا گیا -

"اے خدا میں نے تجھ پر بھروسہ کیا ہے، کبھی حیران و پریشان نہ ہونے دیجیو"

۱؎ شہر لندن کی ایک سڑک ہے ۱۲ ۲؎ یہ بھی ایک سڑک ہے ۱۲ ۳؎ عدالتیں ۱۲ ۴؎ یہ بھی شہر لندن کی ایک سڑک ہے ۱۲

از مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی۔

کِفایت شعاری

فارغ البالی کے زمانہ میں آیندہ کے واسطے فراہم کرنا پیش بینی اور صفت محمود ہے اس لئے ضرور ہے کہ خرچ آمدنی سے زیادہ نہ ہو بلکہ کچھ نہ کچھ ہمیشہ پس انداز ہوتا رہے اگر روزمرہ کا حساب قلمبند کیا جائے تو خواہ مخواہ یہ نظر پڑتی ہے کہ روپیہ کس کس طرح صرف ہوتا ہے اور اِن میں ضروری اور غیر ضروری مدّات کیا ہیں اور جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ آمدنی کیا ہے اور خرچ کیا انسان ضرور فضول خرچی میں پڑ جاتا ہے آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ بچانا اگرچہ قلیل مقدار ہی کیوں نہ ہو ضرور چاہیئے کیونکہ اِس سے طبیعت کو خوشی پیدا ہوتی ہے، اور اطمینان نصیب رہتا ہے اور اگر آمدنی سے زیادہ ایک پائی بھی خرچ ہو جائے تو جان لو کہ رفتہ رفتہ بربادی آنے والی ہے، کیونکہ اِس صورت میں ضرور قرض لینا پڑیگا اور قرض بربادی کی جڑ ہے اگر آمدنی کم ہے تو خرچ کو بھی کم کر دینا ضرور ہے۔ ظاہری شان و شوکت کی حاجت نہیں، عمدہ کھانے اور عمدہ لباس کی ضرورت نہیں۔ خدمتگاروں کے بدلے خود اپنا کام کرنا گوارا مگر قرض نہ لینا چاہیئے۔ جو شخص قرض لیتا ہے وہ ہمیشہ رنجیدہ رہتا ہے روکھی روٹی بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ قرض سے دسترخوان آراستہ کیا جائے اور یہی حقیقت میں قناعت ہے۔ کفایت شعاری ذریعۂ مسرت بھی ہے لہذا

نہ صرف یہ ضرورت ہے کہ اکتساب معاش کے وسیع وسائل اختیار کریں اور اُن کو پوری پوری طرح پر کام میں لائیں بلکہ یہ بھی لازم ہے کہ جو کچھ حاصل ہو اُس کا کچھ حصّہ بطور اندوختہ رکھیں۔ کیونکہ جس قدر کمایا تھا سب کا سب خرچ بھی کر دیا تو محنت اور کاہلی کا انجام ایک سا ہوا عقلمندی یہ ہے کہ مجبوری اور بیکاری کے زمانے کا خیال رکھا جائے اور اچانک ضرورتوں کے واسطے پیش بینی سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرتے رہیں۔

کفایت شعاری بہت سے ناجائز تعیش سے بچاتی اور پرہیز گار رکھتی ہے ساتھ ہی بہت سی مباح خوشیاں بھی بخشتی ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ اگر زیادہ رقم پس انداز نہیں ہو سکتی تو تھوڑی رقم کو کیا بچائیں" دانہ دانہ ہمی شود انبار" تھوڑا تھوڑا جمع ہو کر معتدبہ رقم ہو جاتی ہے جو کسی خاص ضرورت کے وقت کچھ نہ کچھ کام آئے گی۔

کفایت شعاری کے لئے زیادہ لیاقت کی ضرورت نہیں صرف تھوڑا سا طبیعت پر قابو ہونا چاہیئے کہ انسان غیر ضروری اخراجات صرف دل بہلانے یا تھوڑی دیر کی واہ واہ کی خاطر نہ کر بیٹھے اور جب کفایت شعاری کی عادت پڑ جاتی ہے اور کچھ روپیہ جمع ہو جاتا ہے تو اُس کے فوائد خود بخود نظر آنے لگتے ہیں۔ حوادثات زمانہ اور واقعات غیر اختیاری کے وقت مصیبت کی گھڑیوں میں سخت ضرورتوں کے مقابلہ میں اپنا پیسہ بے منّت کام آتا ہے نہ اَوروں کی سخاوت اور فیّاضی۔ اوّل تو کوئی اس قسم کی مدد کرتا نہیں اور اگر کسی نے کی بھی تو غیر مکتفی اور بہزار منّت اگر کوشش بیکار ہی جائے اور کچھ بھی پس انداز نہو سکے تو بھی سعی منفعت سے خالی نہیں اور کچھ نہ ہوگا تو طبیعت میں احتیاط

اور انضباط ہی پیدا ہو جائے گا فضول خرچی کی عادت ہی چھوٹ جائے گی بیہودہ مشاغل ہی
سے بچ جائے گا بیہودہ جذبات ہی رک جائیں گے کسی قدر افکار ہی ہلکے ہو جائیں گے
اور طبیعت کو سکون نصیب ہو جائے گا روپیہ پاس ہوتا ہے تو طبیعت میں عجب استغنا اور
بے فکری کی کیفیت ہوتی ہے، اور بڑھاپے میں یا معذوری کے وقت عزت بنی رہتی
ہے اور طبیعت کو بھی اطمینان ہوتا ہے کہ اولاد ہمارے اندوختہ سے متمتع ہو گی دنیا میں
جس قدر تہذیب پھیلی یہ کفایت شعاری اور اندوختہ کی بدولت ہے کیوں کہ
کفایت شعاری سے راس المال حاصل ہوا اور راس المال سے اشیا پیدا کرنے کی
قوت ہوئی، کفایت شعاری کی عادت بعض لوگوں میں قدرتی ہوتی ہے لیکن اکثر کو
اکتسابی طور پر حاصل کرنی پڑتی ہے اور اس کے لئے ضرور ہے کہ انسان کو آیندہ کی
آسایش و آرام کے لئے موجودہ وقت کی تھوڑی سی غیر ضروری خواہش روکنی پڑے
یہی حال قوموں کا ہے کہ جو قومیں اپنی تمام پیداوار خرچ کر ڈالتی ہیں اور کچھ نہیں
بچاتیں ان کے پاس بالکل راس المال نہیں ہوتا اور وہ ذرا ذرا سی چیزوں کے لئے
دوسروں کی دست نگر ہوتی ہیں ان میں افلاس اور مصیبت پھیلی ہوئی ہوتی ہے اور
بے مائگی کی وجہ سے وہ تجارت بھی نہیں کر سکتیں نہ ان کے پاس جہاز ہوتے ہیں نہ
ریل نہ کشتیاں، لیکن جو قومیں کفایت شعار ہیں وہ آج دنیا کی تہذیب کا چشمہ اور
دولت کا مخزن بنی ہوئی ہیں کسی ملک میں دو وجہ سے افلاس پھیلتا ہے اول روپیہ کی احتیاج
دوم روپیہ کا بیجا صرف اور بڑی وجہ بے ضرورت صرف ہے روپیہ پیدا کرنا تو مشکل ہے

لیکن اُس کو سلیقہ سے خرچ کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہے جو شخص اپنی قوت بازو سے اسقدر پیدا کر لیتا ہے کہ اُس کی احتیاج کو کافی ہو اور کچھ پس انداز ہو جائے تو یہ اندوختہ خواہ کتنا ہی تھوڑا کیوں نہو اُس سے اُس کی اور کُل گھر کی معاشرت کی بہبود پر بڑا اثر پڑتا ہے اور یہ ہی اندوختہ اُس کی آزادی کو قائم رکھتا ہے جس شخص کو خدا نے معمولی عقل بھی دی ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ جو کچھ ہے روزانہ کا روز صرف کر دینا عاقبت اندیشی کے بالکل خلاف ہے جس شخص کو معقول تنخواہ ملتی ہو یا جس کی آمدنی معقول ہو وہ مرتے وقت کچھ نہ چھوڑے اور اسکے بیوی بچے محتاج اور بے سہارے رہ جائیں یا اُن کے سر پر مرحوم کے قرض کا بار پڑے تو سوائے اِس کے کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ ناعاقبت اندیش تھا، یا اِس قدر خود غرض تھا کہ اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کے آگے اُسے کسی بات کی پرواہی نہ تھی، ایسے لوگ اپنی آزادی ساہوکاروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالتے ہیں اور خود نمایشی سامانوں کے پیچھے محتاج ہو جاتے ہیں کسی عارضی حظ یا نمایش کا خیال نہیں رہتا"۔

پرہیزگاری، آزادی، دیانت داری، خودداری، وغیرہ اوصاف کفایت شعاری سے حاصل ہوتے ہیں اور یہ ایسے اوصاف ہیں جن پر انسان کے اخلاق کی بنیاد ہے، اور خودداری کا یہ تقاضا ہے کہ انسان اپنی وضع کو نباہے اور اپنا بار خود اُٹھائے اور اسی میں اُس کی عزت ہے اور اگر دوسروں پر اپنا بوجھ ڈالے گا تو وہ حقیقی عزت و آرام سے نہیں رہ سکتا کیونکہ ہر شخص کو اپنی حاجتوں کا جس قدر احساس ہوتا ہے دوسرے کو نہیں ہوتا۔ اسی طرح اپنے دل کی محبت، اپنے دل کی اُمید، اپنی پسند کا اثر جس طرح خود اپنے اوپر ہوتا ہے دوسروں کو اُس کی پرواہ بھی نہیں ہوتی۔ اِس لئے ہر شریف شخص کا فرض ہے کہ اپنی آیندہ حاجتوں کا

خیال رکھے اور چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے۔ غریب ہونا عیب نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ افلاس بہت سے نیک کام نہیں ہونے دیتا۔ اطمینان اور سکون خاطر کو برباد کرکے خوشیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ کفایت شعاری کے اصول کچھ مشکل نہیں ہیں اور ہر شخص اُن کو سمجھ سکتا اور ذرا سے انتظام سے اُن پر عمل کرسکتا ہے اول تو یہ کہ آمدنی کا تھوڑا سا حصہ خواہ کتنا ہی تھوڑا کیوں نہو، آیندہ کی حاجتوں کے لئے جمع کیا جائے دوم جو کچھ خریدا جائے اُس کی قیمت نقد ادا کردی جائے اور قرض کے کھیڑے سے پرہیز کیا جائے نیز یہ انتظام کیا جائے کہ کوئی چیز قرض لینے کی ضرورت نہ ہو۔ سوم جس کام میں روپیہ لگایا جائے پہلے اُس کے نفع نقصان کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور جس کام میں نفع یقینی نہ ہو اُس میں روپیہ صرف نہ کیا جائے، چہارم آمد و خرچ کا باقاعدہ حساب رکھا جائے پنجم جو چیز خریدی جائے اُس کو احتیاط سے خرچ کیا جائے اور یہ خبر رکھی جائے کہ نوکروں یا اور لوگوں یا خود اپنی غفلت سے خواہ مخواہ ہر چیز ٹوٹ کر خراب نہ ہو اور گھر کی چیزیں اس طرح فضول برباد نہ ہوتی رہیں، کہ ہر وقت اُن کے خریدنے اور بنوانے کی ضرورت رہے، بلکہ ہر شے سلیقے سے استعمال ہو، اور یہ کام گھر کے نوکر یا داروغہ کے ذمہ نہ ہو بلکہ خود صاحب خانہ کو مرد ہو یا عورت نگرانی کرنی چاہئے، جو لوگ غلط اصول پر اپنا کام چلاتے ہیں وہ ناکام رہتے ہیں مثلاً جو لوگ دوسرے کی مدد پر بھروسہ رکھتے ہیں وہ اکثر ناکامیاب رہتے ہیں یا جو لوگ اپنا مال و اسباب ہمیشہ خراب برباد کرتے رہتے ہیں ناکام رہتے ہیں اسی طرح بخیل اور فضول خرچ دونوں ناکام رہتے ہیں (از کتاب حکمت عملی)

از شمس العلما مولوی نذیر احمد ایل ایل ڈی (اڈنبرا)

دُنیاوی ترقّی کا گُر

کبھی آپ صاحبوں نے اِس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اہل یورپ خاص کر انگریزوں کی دُنیاوی ترقّی کا اصل گُر کیا ہے، مَیں انگریزوں کو اِس لئے خاص کرتا ہوں کہ اوّل تو ہم کو اِن ہی لوگوں سے قوی تعلّق ہے کہ یہ ہمارے حاکم ہیں، ہم محکوم، یہ بادشاہ ہیں، ہم رعیّت، دوسرے کیا وسعت رقبہ کے اعتبار سے اور کیا مردم شماری کے اعتبار سے اور کیا ملک کی زرخیزی اور رعایا کی خوش حالی کے اعتبار سے اِن کی سلطنت رُوے زمین کی تمام سلطنتوں سے بیش بیش اور زبردست اور مطمئن تر ہے۔ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں اور بالکل سچ کہتے ہیں کہ کوئن وکٹوریا امپرس آف انڈیا کی سلطنت میں کسی وقت آفتاب غروب نہیں ہوتا، اِس کے یہ معنی ہیں کہ زمین گول ہے اور اپنے اوپر پلٹے کھاتی ہوئی آفتاب کے گرد گھومتی ہے اِس سے رات دن پیدا ہوتے ہیں، تو کسی وقت آفتاب کے غروب نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ کوئن وکٹوریا امپرس آف انڈیا کی سلطنت اِس قدر وسیع ہے کہ اُس کا کوئی نہ کوئی حصہ ہر وقت محاذی آفتاب رہتا ہے، اگر امپرس وکٹوریا کی سلطنت میں کسی وقت آفتاب نہ ڈوبنے کے یہی معنی ہیں، تو اُن میں بھی شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ حکایت واقعی اور

نفس الامری ہے، اروے زمین کا ایک کرہ لو اور جغرافیہ کے نقشوں کی روسے اُس پر جا بجا ملکہ کی عملداری کے نشان کرو۔ تو پاؤ گے کہ جا بجا ملکہ کی عملداری اِس کثرت سے ہے کہ گویا ایک چپّہ بھر جگہ ملکہ کی عملداری سے خالی نہیں، لیکن کرہ لو اور اُس پر نشانات کرو تب تم کو اس کا یقین آئے، مگر ملکہ کی عملداری میں کسی وقت آفتاب کے نہ ڈوبنے کے ایک اور بھی معنی ہیں جس کو آپ لوگ بے کرے اور بے نشان باور کر سکتے ہیں وہ یہ کہ ظلم اور بے انصافی کو اندھیرے سے اور عدل و انصاف کو نور سے تعبیر کرتے ہیں۔ کسی ہائی کورٹ کی ایک حکایت سُنی تھی کہ کوئی حق دار بارسٹروں اور وکیلوں کے قانونی اڑنگوں کی وجہ سے اپنے حق واجب سے محروم ہو گیا جب اُس کو کوئی چارہ باقی نہ رہا تو وہ ایک آخری درخواست ججوں کے پاس لے گیا اور ایک ہاتھ میں درخواست اور دوسرے میں مشعل، روز روشن میں مشعل کی وجہ پوچھی گئی، تو اُس نے کہا کہ اِس عدالت میں اندھیرا ہے اِس لئے میں مشعل لے کر آیا ہوں، علاوہ اِس کے ظُلم و ظُلمت کا مادّہ بھی ایک ہے، تو ملکہ کی عملداری میں کسی وقت آفتاب کے غروب نہ ہونے کا یہ مطلب ہوا کہ اس عملداری میں آفتاب عدل و انصاف ہمہ وقت تاباں و درخشاں رہتا ہے، اور یہ ایک ایسی بات ہے کہ کوئی متنفس اِنکار نہیں کر سکتا۔ اچھا پھر انگریز ایک چھوٹے سے جزیرے انگلستان کے رہنے والے کس کمال کے بنے ہوئے ہیں کہ ربعِ مسکون کے اکثر حصّے پر پھیل گئے اور پھیلنا بھی بادشاہوں کا سا پھیلنا کہ اپنے سے دس گنے پچاس گنے ہو گئے

ہزار گنے، بلکہ زیادہ گنے باشندوں کو زیر کر کے اُن پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ یہ کیوں؟
آیا اس لئے کہ سرد ملک کے رہنے والے ہیں؟ نہیں، یا اس لئے کہ رنگتیں گوری
ہیں؟ نہیں، یا اس لئے کہ عیسائی ہیں؟ نہیں نہیں نہیں۔ اچھا میں اُن کی ترقّی کا
اصلی گُر بتاؤں، سائنس، سائنس کہو، فلسفہ کہو، علم کہو، ایک ہی بات ہے۔ بات تو
ایک ہی ہے۔ مگر جس کو ہم علم سمجھتے ہیں، وہ علم نہیں بلکہ دُوسرے دُوسرے علوم
جس میں اُنھوں نے ترقّی کی یا اُنھوں نے نئے ایجاد کیے۔ ہمارے ہاں تو علم
لفّاظی اور خیالی مفروضات کا نام تھا... لیکن اب علم کی شان بدل گئی ہے
اُس کا دائرہ نہایت وسیع ہو گیا ہے۔ کوئن وکٹوریہ ایمپرس آف انڈیا کی سلطنت
سے بھی اضعافاً مضاعفہ، اب خیالی مفروضات کی جگہ واقعات ہیں اور تمام
موجوداتِ عالم اور اُن کے تمام حالات میں سے ایک ایک موجود اور اُس کا
ایک ایک حال علم جداگانہ کا موضوع لہٗ ہے، علوم میں ایسی شوگافیاں ہو رہی
ہیں کہ ایک ایک علم میں سے کتنی کتنی شاخیں پھوٹتی چلی آتی ہیں، اور ہر شاخ
بجائے خود ایک علم جداگانہ ہے۔

سائنس کی ترقّی کے نہ صرف یہ معنی ہیں کہ اہلِ یورپ نے سیکڑوں ہزاروں
نئی باتیں دریافت اور ایجاد کی ہیں جو یونانیوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں
بلکہ علم ہیئت، کیمیا، طبعیات۔ طبقات الارض، علم فصاحت، تاریخ، جغرافیہ
شاید ہی کوئی علم ہوگا جس میں فلاسفہ یورپ نے یونانیوں کی غلطیاں نہ پکڑی ہوں

غرض یورپین سائنس کے بتانے سے مجکو یونانیوں کی نئی غلطیاں معلوم ہوئیں۔
اِس وقت میں صرف ایک ہی بات کہنی چاہتا ہوں کہ یونانیوں کے سکھانے سے ہم لوگ مانتے چلے آتے ہیں۔ کہ دُنیا چار عناصر سے بنی ہے۔ باد و خاک و آب و آتش۔ اور یہ چاروں بسیط ہیں کہ اِن میں ترکیب نہیں اہلِ یورپ نے ہوا میں ترکیب ثابت کی اور علم کیمیا کے زور سے آکسیجن۔ ہیڈروجن۔ نائٹروجن۔ تین قسم کی مختلف الخواص ہوائیں الگ الگ کر کے دکھا دیں۔ اِسی تحقیقات میں منکشف ہوا کہ آکسیجن کے بدون آگ نہیں جل سکتی۔ نباتات کو نمو نہیں ہو سکتا۔ جب تک ایک خاص نسبت کے ساتھ آکسیجن اور ہیڈروجن کا امتزاج نہ ہو پانی نہیں برس سکتا۔ انسان کو خلیفۃ اللہ کہا جاتا ہے اور اِس خلافت کے یہی معنی ہیں کہ خدا نے انسان کو عقل دی ہے جس کی مدد سے وہ مخلوقات کے خواص اور اُن کی تاثیرات اور علّت و معلول کے تعلقات کو دریافت کرے اور دریافت کیے پیچھے مخلوقات میں تصرفات کرے جو اُس کے لئے بکار آمد ثابت ہوں۔ انسان ایسا کرے تو حقیقت میں وہ اپنا فرض انسانیت ادا کرتا ہے۔ اور اِسی لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اُس کی تحقیقات کسی درجہ تک اور اُس کے تصرفات کسی حد تک پہونچیں اُس کو چاہیے کہ دائرۂ عبودیت سے قدم باہر نہ رکھے سر آئزک نیوٹن جس کو یورپ کے فلسفیوں کا جدّ امجد کہنا چاہیئے اور یورپ کے فلسفیوں کا جد امجد ہوا تو ہندوستان کے نئے فلسفیوں کا پردادا۔ بہرکیف

نیوٹن باایں رسائی ذہن کہ اُس نے لا آف گریوٹیشن اور ایٹرکشن دریافت کرکے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔کہا کرتا تھا کہ "میں جو اسرار نیچر کی ٹوہ میں لگا رہتا ہوں میری مثال اُس بچے کی سی ہے جو سمندر کے کنارے بیٹھا گھونگے اور سیپیاں جمع کر رہا ہو اور قعرِ دریا میں جو موتیوں کا ذخیرہ ہے اُس کی اُس کو خبر تک نہیں"۔ جو شخص کوئی مفید چیز ایجاد یا دریافت کرتا ہے۔اس کو وہیں تک فخر کرنے کا حق ہے جیسے رمضان کے بعد ہلال عید کے لئے لوگ سخت بے قرار ہوتے ہیں وہ نہ جنتری کو مانتے ہیں نہ تیئرے کو نہ دُوج کو اور نہ مطلع کے صاف یا نا صاف ہونے کی پروا کرتے ہیں بلکہ اُنتیسویں تاریخ کچھ دن رہے سے میدانوں میں نکل جاتے یا بلندیوں پر جا بیٹھتے ہیں۔ایک بھیڑ کی بھیڑ چاند دیکھتی ہوتی ہے اور اُن میں سب سے پہلے چاند ایک شخص کی نظر چڑھ جاتا ہے اور وہ خوش ہوتا ہے پس ایسی ہی خوشی اور اتنی ہی خوشی ایک موجد اور مخترع کو ہونی چاہیئے چاند کے دیکھنے والے نے اُتنا ہی کیا کہ سب سے پہلے چاند دیکھا نہ یہ کہ چاند بنایا یا اُس نے آنکھ بنائی اور اُس کو قوت بصارت دی اِسی طرح جس نے سب سے پہلے مثلاً سٹیم کی طاقت دریافت کی اُس نے نہ پانی کو پیدا کیا نہ آگ کو اور نہ پانی اور آگ کی اُس خاصیت کو کہ آگ کی حرارت پاکر پانی کی سٹیم بنے اور نہ اُس نے سٹیم میں یہ زور ڈالا کہ وہ روکے نہ رُکے اور دبائے نہ دبے۔

سوامی جی کا دُوسرا سفر

رستہ کی کیفیت

اب رستہ کی کیفیت سُنو۔ اوّل تو دامنِ کوہ میں کوسوں تک جنگل اور بَن ہے، جس میں سخت خونخوار درندے زہریلے سانپ اور ہیبت ناک اژدہے رہتے ہیں، وحشی ہاتھیوں کے غول کے غول آزاد پھرتے ہیں۔ رستے کا کہیں پتہ نہیں سرزمین گرم۔ ہوا ناقص۔ پانی مُہلک۔ غرض اِس خوفناک جنگل سے صحیح سلامت نکل جانا سخت مشکل ہے۔ تنہا آدمی کو تو بہت دشوار ہے اِسی لئے جب بہت سے جاتری جمع ہو جاتے ہیں تو قافلہ کا قافلہ کمیٹی بنا کر چلتا ہے تاکہ وقت پڑے تو ایک کی ایک مدد کرے۔ ہمارے قافلہ میں سب زن و مرد کوئی سَو آدمی تھے۔ دِن کو چلتے تو سب کے سب شور و غل مچاتے۔ رات کو ٹھہرتے تو گرداگرد آگ جلاتے تاکہ موذی جانوروں کے حملے سے امن ملے۔

اثنائے سفر میں ایک دن جھاڑی میں سے ایک شیر جھپٹا اور ایک مُسافر کو دبوچ کر لے ہی گیا۔ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ہائے ہائے کرنے اور غُل مچانے کے سوا کسی سے کچھ نہ بن پڑا۔ ایک دِن ایک بڑا سانپ درخت کے اوپر سے گرا اور نیچے جو آدمی بیٹھا تھا۔ اُس کو لپٹ گیا۔ ہرچند چھڑانے کی کوشش کی مگر کچھ کارگر نہ ہوئی ناچار لاٹھیوں سے پیٹنا شروع کیا خیر سانپ تو مر ہی گیا

مگر وہ آدمی بھی نہ بچا۔ ایک دن چند تھکے ماندے مسافر ایک لٹھے پر جا لیٹے۔ کچھ ضرورت جو پیش آئی تو کسی نے وہیں آگ سُلگادی جس وقت آگ تیز ہوئی تو لٹھا جنبش میں آیا تب معلوم ہوا کہ یہ تو اژدہا ہے ہم سب نے بھاگ کر جان بچائی۔ ہمارے کتنے ہی ساتھی آب و ہوا کی خرابی سے ایسے بیمار پڑے کہ کوئی اِس منزل کھیت رہا۔ کوئی اُس منزل۔ غرض بہت سی جانیں ضائع کر کے ہم تھکے ماندے نیم جان بہزار خرابی پہاڑ تک پہونچے۔ جس کی بلندی کو دیکھ کر خوف آتا تھا۔ اب یہاں سے چڑھائی شروع ہوئی۔ جنگل تو ایسا گنجان نہ تھا جیسا طے کر کے آئے تھے۔ جانور بھی کم تھے۔ پانی البتہ مشکل سے ملتا تھا۔ مگر جو ملتا وہ صاف اور شیریں تھا۔ ہوا بھی تو گرم لیکن ایسی مُضر نہ تھی جیسی بن کی۔ تاہم سب مصیبتوں کی ایک مصیبت یہ کمبخت چڑھائی تھی جس نے مسافروں کے چھکّے چھڑا دیے۔ دم ٹوٹ گیا، گھٹنے تھک گئے۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں چند آدمی جو کمزور تھے ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اُٹھّے۔ لوگوں نے بہت سہارا دیا۔ ہمّت بندھائی۔ مگر جب اپنا ہی بل بوتا کام نہ دے تو ساتھیوں کی مدد سے کیا ہو سکتا ہے، اب ہم ایک ایسی جگہ پہونچ گئے جہاں سے سفر دلچسپ و آسان ہوگیا۔ یہ مقام نہایت پُر فضا خوشنما اور سرسبز تھا۔ جابجا سرد و شیریں چشمے جاری ڈھالنوں پر خود رَو پھولوں کے تختے کے تختے کھِلے۔ درختوں پر خوبصورت پرند خوش الحانی سے چہچہاتے۔ جن کی صدا ہوا میں گونج اُٹھتی تھی۔ ہرن

پاڑھے۔ لنگور۔ اُچھلتے پھرتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم سچ مچ ایک گلزار پُربہار میں گُل گشت کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہاں بھی چڑھائی سخت مشکل تھی۔ مگر کچھ تو ہم کو اُس کی مشق ہوگئی تھی۔ کچھ اِس دلکشا مقام کی خوبی نے ہماری محنت کو ہلکا کر دیا تھا۔ اِس لئے اب سفر ناگوار نہ تھا۔

چلتے چلتے اِس حصّے کو طے کر کے ہم کوہستان کے اُس سلسلے پر جا پہونچے جو موسم سرما میں برف سے ڈھکا رہتا اور صرف گرمی کے دنوں میں قابل گذر ہوتا ہے یہاں ایک وسیع میدان تھا۔ جو سبزی اور رنگا رنگ بیل بوٹوں اور بوقلموں پھول پتّوں سے ایسا آراستہ و مرتّب نظر آتا تھا گویا فرّاش قدرت نے بوٹے دار فرش زمرّدین نو وارد مہمانوں کے لئے ابھی بچھایا ہے۔ اور اِس صحن دل افروز کو اپنی صنعت کی میناکاریوں سے خوب جی لگا کر سجایا ہے۔ اُس میں سے ایسی بھینی بھینی مہک نکل رہی تھی۔ جو دل و دماغ کو تر و تازہ کرتی تھی۔ ہم کو تو یہ گمان ہوا کہ شاید پجاری دیوی جی کو دوپ دیپ دے رہے ہیں۔

چھ مہینے تک جو برف جمی رہتی تھی۔ تو اِس وجہ سے نہ کوئی درندہ چرندہ چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ نہ کہیں اونچے درختوں کا نشان تھا۔ البتّہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت خوش رنگ۔ خوش آواز پرندے جا بجا چہک رہے تھے۔ یہاں کی دلکش فضا اور لطیف ہوا، پرندوں کی چہک اور سبزہ کی لہک، دل پر عجیب اثر پیدا کرتی تھی۔ جو بیان میں نہیں آ سکتا۔ اِس چوتھی منزل میں کچھ فاصلہ پر

برفستان سے ملا ہوا دیوی جی کا مندر ہے۔ اب ہم ایک ایسی جگہ پہونچے جہاں سے مندر صاف نظر آتا تھا۔

پہاڑوں کا اُبھار

میں ایک سادھو سے عجائبات قدرت کی نسبت بات چیت کرتا چلا جارہا تھا کہ ایک شخص بولا "کیوں مہاراج! یہ پہاڑ اتنے اونچے کیونکر ہو گئے؟ اور ان سے دُنیا کو کیا فائدہ پہونچتا ہے؟ اور یہاں ایسا کڑاکے کا جاڑا کیوں ہے؟" سادھو صاحب نے فرمایا کہ "ان پہاڑوں کی ہزار ہا من مٹی ہر سال کی بارش میں دُھل دُھلا کر دریاؤں کی راہ سے سمندر میں پہونچ جاتی ہے۔ جس سے سمندر کی سطح قعر ہر سال بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور پہاڑوں کی بلندی گھٹتی جاتی ہے کہیں مُدتہائے دراز میں یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ سمندر کی تہ پہاڑوں کی اونچائی سے بھی زیادہ بلند ہو جاتی ہے۔ تب سمندر کا پانی اس نشیب کی طرف آنے لگتا ہے اور پہاڑ کی جگہ سمندر اور سمندر کی جگہ پہاڑ بن جاتا ہے اور ایسی تبدیلیاں اس کرۂ زمین پر سمندر کی بدولت ہوتی رہتی ہیں۔ مگر مدتہائے دراز میں۔ جہاں اب ہمالیہ پہاڑ ہے۔ یہاں کسی زمانے میں سمندر تھا۔ اس امر کی تصدیق اُن بڑی سمندری مچھلیوں کے کھانکروں سے ہوتی ہے۔ جو ہمالیہ کی بلند چوٹیوں پر پائے گئے ہیں۔ دوسری وجہ ناہمواری زمین کی یہ ہے کہ جب بطن زمین کے اندر کے سوختنی مادے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ تو مٹی کے بالائی طبقے کو اُلٹ پلٹ

کرکے پہاڑوں کو نمودار کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات زمین کی اندرونی حرارت
مشتعل ہوکر پہاڑ کے منفذوں سے پھوٹ نکلتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں
جو جوالا مکھی پہاڑ مشہور ہے۔ وہاں ایسے ہی شعلے نکلتے ہیں جن کو جوالا مکھی
دیبی کہتے ہیں۔ سال میں دو بار وہاں میلہ لگتا ہے جس میں اطراف و
جوانب سے آکر بہت جاتری جمع ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات یہی
اندرونی حرارت ایسا جوش مارتی ہے کہ پہاڑ کے پرخچے اُڑا دیتی ہے اور
گرم راکھ اور پتّھر ایسں زور شور سے ہوا میں اُڑتے ہیں کہ کوسوں تک
اُن کا مینھ برس جاتا ہے۔ ایسے پہاڑ "کوہ آتش فشاں" کہلاتے ہیں جب
آتش فشانی ہوتی ہے تو گرم راکھ اور پتّھروں کے علاوہ بعض وقت پہاڑ
کے موکھے میں سے ایک سیّال مادہ پگھلی ہوئی دھات کے مانند نکلتا ہے
اور یہ آتشیں رَو جن بستیوں سے گذرتی ہے۔ اُن کو جلا بھون کر تہس نہس
کر ڈالتی ہے، ایسے حادثات کے وقت بعض اوقات ہولناک آواز ہوتی
اور دُور دُور تک لرز جاتی ہے۔ اِسی کو بھونچال یا زلزلہ کہتے ہیں۔ اندرونی
حرارت کی وجہ سے بعض پہاڑی مقامات میں گرم پانی کے چشمے اُبلتے
ہیں۔ بدری ناتھ جی میں ایک ایسا ہی چشمہ ہے۔ بعض چشموں کے پانی
میں معدنی جزو بھی شامل ہوتا ہے۔ جیسے نینی تال کے ایک چشمے سے
گندھک ملا پانی نکلتا ہے اور یہ پانی بہت ہاضم ہوتا ہے۔

پہاڑوں کے فائدے

اِن پہاڑوں سے نوع انسان کو بہت فائدے پہونچتے ہیں۔

اوّلؔ تو سونا۔ چاندی۔ لوہا۔ تانبا وغیرہ کُل دھاتوں کی کھان پہاڑوں ہی میں ہوتی ہے۔ گویا پہاڑ ہماری دولت کے خزانے ہیں۔

دوسرؔے اونچے اونچے پہاڑوں پر بارش بھی خوب ہوتی ہے اور برف پڑتی ہے۔ جس سے بڑے بڑے دریا ہمیشہ جاری رہتے۔ میدانوں کو سیراب و شاداب کرتے اور کاشتکاری و تجارت کو نفع پہونچاتے ہیں۔

تیسرؔے صدہا قسم کی معدنی اور نباتی دوائیں ہیں۔ جو پہاڑوں سے دستیاب ہوتی ہیں۔ ان کے استعمال سے آدمی قوت و صحت حاصل کرتے۔ اور بیماریوں سے شفا پاتے ہیں۔

چوتھےؔ پہاڑی جانوروں سے بہت سی کارآمد چیزیں ہم کو حاصل ہوتی ہیں ہرن کا مُشک۔ پہاڑی بکریوں کی مہین اون۔ جس کے شال دوشالے بُنے جاتے ہیں۔

پانچوؔیں۔ بیش بہا جواہرات بھی پہاڑی سرزمینوں میں ملتے ہیں۔

چھٹےؔ۔ سنگ مرمر سنگ موسیٰ سنگ پٹھانی سنگ سرخ وغیرہ قسم قسم کے پتّھر پہاڑوں سے کاٹ کر لاتے اور آدمی اپنے لئے بڑی بڑی عالیشان اور پختہ عمارتیں تیار کرتے ہیں جو صدہا سال تک قائم رہتی ہیں۔ جیسے آگرہ میں تاج گنج کا روضہ کہ جس کی تعمیر کو قریب ڈھائی صدی کے ہوئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ گویا آج تیار ہوا ہے۔

ساتویں پہاڑوں میں بعض مقام ایسے صحت افزا اور دلکشا ہوتے ہیں کہ وہاں جانے سے سیر و تفریح کے علاوہ تندرستی بحال ہوتی ہے۔ جیسے کشمیر شملہ نینی تال وغیرہ۔ جہاں خاص کر گرمی کے موسم میں دُور دُور کے لوگ آتے اور وہاں کے چشمہ ساروں اور مرغزاروں سے بہشت بریں کا لُطف اُٹھاتے ہیں دربارِ اکبری کا ایک شاعر جو اپنے آقا کے ہمرکاب کشمیر گیا تھا۔ اُس کی تعریف میں لکھتا ہے ؎

این چشمہ و این سایہ و این سبزہ و این گل	وصفش نہ چناں ست کہ در گفت درآید

ترجمہ۔ یہ چشمہ، یہ سایہ، یہ سبزہ، یہ پھول، ان کی تعریف لفظوں میں ادا نہیں ہوسکتی

عمدہ آب و ہوا اور دلکش فضا کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کے یوگی اور سنیاسی بھی ایسے مقامات میں رہتے ہیں۔ کیونکہ یوگ وہاں اچھا ہوتا ہے۔ ایک فلاسفر کا قول ہے کہ "جس کو قدرت کی شان دیکھنی منظور ہو اُس کو چاہیے کہ پہاڑ اور سمندر کی سیر ضرور کرے کیونکہ قدرت کی شان دار کار روائیاں ان ہی دو مقامات میں نظر آتی ہیں" مہاراج شنکر اچاریہ نے ہندوستان کے چاروں کونوں پر چار مندر۔ بدری ناتھ۔ جگناتھ۔ سیت بند رامیشر اور دوارکا قائم کیے تاکہ دُور دراز خطوں کے جاتری وہاں جاکر بزرگ سادھوؤں اور کامل فقیروں سے اُپدیش حاصل کریں۔ اس ضمن میں ہندوستان بھر کی سیر اور سمندروں اور پہاڑوں کی دیکھ بھال اور عجائباتِ قدرت کا مشاہدہ مُفت ہے۔

سردی اور برف

دیکھو یہ سوال جو دل میں پیدا ہوا کہ ایسی شدّت کی سردی یہاں کیوں ہے تو اُسی وقت پیدا ہوا جب کہ نشیبی میدان سے چل کر اونچے پہاڑ پر آئے سو یہ کچھ اچنبھے کی بات نہیں۔ یہ تو قدرتی قاعدہ کے بموجب ہے۔ آفتاب کی تپش جو زمین میں داخل ہوکر اُس سطح کو گرم کر دیتی ہے تو سطح زمین کے قریب قریب کی ہَوا بھی گرم ہوجاتی ہے۔ اور جو ہَوا اونچی ہے۔ وہ بدستور سرد رہتی ہے بلکہ جس قدر زمین سے اونچی ہوگی اُسی قدر زیادہ ٹھنڈی ہوگی۔

اب اِن پہاڑوں پر جو ہَوا چلتی ہے۔ وہ سطح زمین کی ہَوا سے بہت ہی بلند ہے۔ اِسی واسطے بہت سرد ہے۔ اور اِسی لئے جاڑے کا موسم معلوم ہوتا ہے۔ جب ہَوا میں سردی کا درجہ تھرما میٹر کے حساب سے صِفر سے نیچے پہونچ جاتا ہے تو اُس میں بادل جم کر یوں برسنے لگتے ہیں۔ جیسے دُھنی ہوئی روئی کے پہَل۔ اُس کو برف کا گرنا کہتے ہیں۔ جب برف گرتا ہے۔ تو بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ زمین، درخت، مکانات، سب برف سے سفید ہوجاتے ہیں گویا ہلکی دُھنی ہوئی روئی بچھا دی ہے۔ چلو تو پاؤں دھنس جاتا ہے مگر یہ کیفیت تازہ برف کی ہوتی ہے بعد کو وہ جم کر مثل پتّھر کے سخت ہوجاتا ہے۔ برف یہاں اونچے پہاڑوں پر گرتا ہے۔ نیچے پہاڑوں اور میدانوں پر کبھی نہیں گرتا۔ اِن سرد مقامات میں دریاؤں اور تالابوں کے

پانی کی سطح پر جو برف جم جاتا ہے اُس کے نیچے پانی بدستور رہتا ہے۔ اوپر انسان و حیوان چلتے ہیں اور نیچے مچھلیاں تیرتی ہیں۔ کل جو تم نے دریا کو عبور کیا تو یہ ہی کیفیت تھی۔ تم برف پر چل رہے تھے اور نیچے پانی شور کرتا بہہ رہا تھا یہ جو سامنے کے پہاڑوں کی چوٹیاں سفید نظر آتی ہیں ایسی اونچی ہیں کہ بارہ مہینے اُن پر برف جمی رہتی ہے۔ (سدرشن کا میلہ)

از شمس العلما مولوی نذیر احمد ایل ایل ڈی (اڈنبرا)

خود غرض دوست پر بھروسا

اور

باپ کی نافرمانی

کلیم شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا۔ اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہونچا ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی۔ لیکن مرزا جیسے نکمے بے فکرے کبھی کے لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی۔ کہ شاید اس کا نانا (وہ بھی حقیقی نہیں) ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب رزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اول تو ایسی عالی جاہ سرکار دوسرے اعتبار منصب۔ اردلی کا جمعدار تیسرے اُن دنوں کی بے عنوانی۔ اُس پر

خود اُس کی رشوت رسانی۔ بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اُس کا اعتدال دہلی کے رُو داروں میں ہوگیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہوگئی۔ جمعدار نے ربا وجودیکہ دُور کی قرابت تھی) حسبۃً للہ اس کا تکفل اپنے ذمّے لیا، جمعدار اپنی حیات میں تو اِتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اُس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی لیکن جمعدار کے مرنے پر اُس کے بیٹے پوتے۔ نواسے کثرت سے تھے۔ اُنھوں نے اِعتنا نہ کی۔ اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر مرے تھے۔ مگر اُن کے ورثا نے بہزار دقت محلسرا کے پہلو میں ایک چھوٹا سا قطعہ رہنے کو دیا اور سات روپیہ مہینے کے کرایہ کی دو دکانیں مرزا کے نام کر دیں یہ تو حال تھا کہ مرزا، مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی تین آدمی۔ اور سات روپیہ کی کُل کائنات اُس پر مرزا کی شیخی اور نمود۔ یہ مسخرہ چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے جن کو صدہا روپیہ کی مستقل آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اُس کو منھ نہیں لگاتے تھے مگر یہ بے غیرت زبردستی اُن میں گھُستا تھا۔ یہ کسی کو بھائی جان۔ کسی کو ماموں جان کسی کو خالو جان بناتا۔ اور وہ لوگ اِس کے اِدّعائی رشتے ناتوں سے جلتے اور دِق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا۔ اُس کے حق میں اور بھی زبوں تھا۔ اُن کی دیکھا دیکھی اُس نے تمام عادتیں امیرزادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں مگر امیرزادگی نبھے تو کیسے بنھے۔ دو دکانیں گِروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بے چاری بہت بکی، مگر کون سُنتا تھا۔

مرزا کی وضع

مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیہ کی۔ سر پر ڈوہری بیل کی
بھاری کامدار ٹوپی۔ بدن میں ایک چھوڑ دو انگرکھے۔ اوپر شبنم یا ہلکی تنزیب
نیچے کوئی طرحدار ساڈھاکے کا نینو۔ جاڑا ہو تو بانات مگر سات روپیہ گز سے کم
نہیں۔ خیر یہ تو صبح و شام۔ اور تیسرے پہر کاشانی مخمل کی آصف خانی جس میں
حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی۔ سرخ نیفہ کا
پائجامہ۔ اگر ڈھیلے پائنچوں کا ہوا تو کلی دار۔ اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے
اشارے سے دو قدم آگے۔ اور اگر تنگ موہری کا ہوا تو نصف ساق تک
چوڑیاں۔ اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا۔ ریشمی ازاربند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا
اور اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھا۔ تو مرزا صاحب اس
ہیئت کذائی سے چھیلا بنے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ کلیم سے اور مرزا
سے محفل مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر
تشریف لانے لگے یہاں تک کہ اب چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی
چھننے لگی کہ گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی
اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی۔ لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے اور تمام دن
کلیم کے پاس رہتے مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا کلیم یہی جانتا تھا کہ
جمعدار کا سب ترکہ مرزا کو ملا اور جمعدار کی محلسرا کو مرزا کی محلسرا اور جمعدار کے دیوان خانہ کو

مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا اور اِسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا۔ تو سیدھا جمعدار کی محلسرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کُنڈی کے کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لیے ہوئے اندر سے نکلیں۔ اور اُن میں سے ایک نے پوچھا کہ "کون صاحب ہیں؟ کون صاحب ہیں؟ اور اِتنی رات گئے کیا کام ہے"؟

کلیم۔ جاؤ مرزا کو بھیجدو۔

لونڈی۔ کون مرزا؟

کلیم۔ مرزا ظاہر دار بیگ جن کا یہ مکان ہے اور کون مرزا۔

لونڈی۔ یہاں کوئی مرزا ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اِتنا کہکر قریب تھا کہ لونڈی کواڑ بند کرلے۔

کلیم۔ کیوں جی! کیا یہ جمعدار صاحب کی محلسرا نہیں ہے؟

لونڈی۔ ہے کیوں نہیں۔

کلیم۔ پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے؟ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

لونڈی۔ جمعدار کے وارثوں کو خُدا سلامت رکھے مُوا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہے؟

دوسری لونڈی۔ اری کمبخت! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں،

وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے (کلیم کی طرف مخاطب ہوکر)
کیوں میاں! وہی ظاہر دار بیگ، جن کی رنگت زرد زرد ہے؟ آنکھیں کرنجی
چھوٹا قد۔ دبلا ڈیل۔ اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔

کلیم۔ ہاں ہاں! وہی ظاہر دار بیگ۔

لونڈی۔ تو میاں! اِس مکان کے پچھواڑے اُپلوں کی ٹال کے برابر
ایک چھوٹا سا کچّا مکان ہے۔ وہ اُس میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جا آواز دی۔ تو کچھ دیر کے بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ
جانگیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے۔ اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے "واہا
آپ ہیں! معاف کیجئے۔ میں سمجھا، کوئی اور صاحب ہیں۔ بندہ کو کپڑا پہن کر
سونے کی عادت نہیں" "میں ذرا کپڑے پہن آؤں۔ تو آپ کے ہمرکاب چلوں"

کلیم۔ چلیے گا کہاں؟ میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا"

مرزا۔ پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا منظور ہو۔ تو میں اندر پردہ کرا دوں۔

کلیم۔ میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیّت سے آیا ہوں۔

مرزا۔ بسم اللہ! تو چلیے اِس مسجد میں تشریف رکھیے۔ بڑی فضا کی جگہ ہے میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا، تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت چھوٹی سی مسجد ہے،
وہ بھی ویران، وحشت ناک۔ نہ کوئی حافظ ہے، نہ مُلّا، نہ طالب علم، نہ مسافر، ہزارہا
چمگادڑیں اُس میں رہتی ہیں کہ اُن کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے

پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود گھڑ بجّے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار ناچار اُسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کر کے کہ جب کلیم مایوس ہو چکا تھا قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے مرزا صاحب بطور دفع دخلِ مُقدّر فرمانے لگے کہ "بندہ کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے خفقان کا عارضہ، اختلاج قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو اُن کو غشی میں پایا۔ اس وجہ سے دیر ہوئی" پہلے تو یہ فرمائیے کہ "اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے"؟

کلیم نے باپ کی طلب۔ اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار۔ تمام ماجرا کہہ سنایا۔

مرزا۔ پھر اب کیا ارادہ ہے؟

کلیم۔ سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا تو ارادہ نہیں ہے۔ اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا۔ خیر نیّتِ شب حرام صبح تو ہو آپ بے تکلّف استراحت فرمائیے میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں۔ اور مجھ کو مریضہ کی تیمار داری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج اُس کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دُہری محلسرائیں متعدد دیوان خانے۔ کئی پائین باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹرے اور گنج اور دُکانیں اور سرائیں ہیں۔ میں جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی مِلک نہ بتایا ہو یا یہ حال ہے کہ ایک تنفس کے واسطے

ایک شب کے لئے تم کو جگہ میسّر نہیں ۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کیے ۔ اُن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ تم جمعدار کے تمام ترکہ پر قابض اور متصرّف ہو۔ لیکن میں اُس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمّہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا۔ آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجّب کی بات ہے۔ اتنی مدّت مجھ سے آپ سے محبّت رہی۔ مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور عادت کو نہ پہچانا ۔ یہ اختلافِ حالت جو آپ دیکھتے ہیں اُس کی ایک وجہ ہے بندہ کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنّٰی کیا تھا ۔ اور اپنا جانشین کر مرے تھے ۔ شہر کے کُل رؤسا اِس سے واقف و آگاہ ہیں ۔ اُن کے انتقال کے بعد لوگوں نے اِس میں رخنہ اندازیاں کیں ۔ بندہ کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے ۔ صحبتِ ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہوگیا ۔ لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ ۔ بند و بست کا حوصلہ نہیں ۔ اُسی روز سے واویلا مچی ہوئی ہے ۔ اور اِس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندہ کو منا لے جائیں ۔

کلیم۔ لیکن آپ نے اِس کا تذکرہ بھی نہیں کیا ۔

مرزا۔ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلالِ مزاج سے بے بہرہ اور غیرت و حمیّت سے بے نصیب ٹھہرتا ۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے اجازت دیجئے کہ میں جا کر بچھونا بچھوا دوں اور مریضہ کی تیمار داری کروں ۔

کلیم۔ خیر مقام مجبوری ہے لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجئے ۔ تاریکی کی وجہ

سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔
مرزا۔ چراغ کیا۔ مَیں نے تو لمپ روشن کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن گرمی کے دِن ہیں۔ پروانے بہت جمع ہو جائیں گے۔ اور آپ زیادہ پریشان ہو جیے گا۔ اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کر گرنی شروع ہوں گی۔ اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گی۔ تھوڑی دیر صبر کیجیے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔
کلیم جب گھر سے نِکلا تو کھانا تیار تھا۔ لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اُس نے کھانے کی مطلق پروا نہ کی اور بے کھائے نِکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے مِلنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں گے تو کہہ دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا۔ کیونکہ اوّل تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ اُس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے نِکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اِس بات سے متعرض نہ ہوا۔ کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اُس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اِس پہلو پر نہیں آتا۔ اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہونا چاہتا ہے۔ تو بیچارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ "سُنو یار! مَیں نے کھانا بھی نہیں کھایا"
مرزا۔ سچ کہتے ہو! نہیں۔ جھوٹ بہکاتے ہو۔
کلیم۔ تمہارے سر کی قسم میں بُھوکا ہوں۔

مرزا - مردِ خدا تو آتے ہی کیوں نہ کہا۔ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے
دوکانیں سب بند ہوگئیں اور جو ایک دو کُھلی بھی ہیں۔ تو باسی چیزیں رہ گئی
ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے۔ لیکن دیوِ اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمّت
والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے۔ کہ جاؤں چھدامی بھڑ بھونجے
کے یہاں سے گرم گرم خستہ چنے بھنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کے مجھ کو تم کو
دونوں کو کافی ہوں گے۔ رات کا وقت ہے۔

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اُٹھ باہر گئے۔ اور
چشم زدن میں چنے بھنوا لائے۔ مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے یا تو کم کے لائے
یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے۔ اِس واسطے کہ کلیم کے روبرو تین مٹّھی چنے
سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا - یارا! ہو تم بڑے خوش قسمت کہ اِس وقت بھاڑ مل گیا ذرا دَ اللہ ہاتھ
تو لگاؤ دیکھو تو کیسے کھلس رہے ہیں! اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجیب ہی
دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا تعجّب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹّی کا
عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہ ہوا۔ کوئی فن ہو
کمال بھی کیا چیز ہے! دیکھیے اتنی تو رات ہو گئی ہے۔ مگر چھدامی کی دُکان پر
بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے تحقیق سُنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں
چھدامی کی دکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے۔ اور واقع میں ذرا

آپ غور سے دیکھیے۔ کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمھیں میرے سر کی قسم! سچ کہنا۔ ایسے خوب صورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے۔ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانہ پر خراش تک نہیں۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور ہے اور دانوں کی رنگت دیکھیے کوئی بسنتی ہے۔ کوئی پستئی۔ غرض دونوں رنگ خوشنما۔ یوں تو صدہا قسم کے غلّے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں۔ لیکن چنے کی لذّت کو کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سُنی ہے؟

کلیم۔ فرمائیے۔

مرزا۔ چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیلؑ کی خدمت میں جن کو ارزاقِ عباد کا اہتمام سپرد ہے۔ فریاد لے کر گیا۔ کہ "یا حضرت! میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے؟ کہ جوں ہیں نے زمین سے سر نکالا تیرِ ستم چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی پر نہیں ہوتے۔ نشو و نما کے ساتھ تو میری قطع و برید ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے ہیں۔ اور مجھے کچّے کو کھا جاتے ہیں۔ جب بارآور ہوا۔ تو خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ آدمی بکری بن کر لاکھوں من بوٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی۔ تو ہولے کرنے شروع کیے۔ بچّا تو شاخ، برگ، بھس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ اُس کو چکّی میں دلیں گھوڑوں کو کھلائیں۔

بھاڑ میں بھونیں بین بنائیں۔ کھولتے ہوئے پانی میں اُبالیں گھنگنیاں پکائیں غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔" چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح پر بے باکانہ چٹر پٹر بولنا سُن کر حاضرین دربار اس قدر ناخوش ہوئے۔ کہ ہر شخص اُسے کھانے کو دوڑا۔ چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر چنا بے انتظارِ حکم اخیر رخصت ہوا۔ سو حضرت! یہ چنے ایسے لذّت کے بنے ہیں۔ کہ فرشتوں کے دندان آز بھی اِن پر تیز ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ اِس وقت نمک مرچ ہم نہیں پہونچ سکتا، ورنہ میر مدد کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں!

غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔ کلیم بھوکا تو تھا ہی اس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزے دار معلوم ہوئے

کلیم کی حالت کا تغیّر

مرزا نے گھر جاکر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا متغیر ہو جانا۔ عبرت کا مقام ہے۔ یا خلوت خانہ اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آ کر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا حال تھوڑا سا ہم نے اوپر بیان کیا۔ گھر کے الوان نعمت کو لات مار کر نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی، نہ بہن، نہ بھائی، نہ مونس نہ غم خوار، نہ نوکر، نہ خدمت گار مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا

جیسے قید خانہ میں حاکم کا گنہگار یا قفس میں مُرغِ نو گرفتار۔ اور کوئی ہوتا تو اِس حالت پر نظر کر کے تنبیہ پکڑتا۔ اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا۔ اور اُسی وقت نہیں تو سویرے گجر دم باپ کے ساتھ نمازِ صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوچنے تھے اُس نے رات بھر میں ایک قصیدہ مسجد کی ہجو میں تیار کیا۔ اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔ صبح ہوتے آنکھ لگ گئی۔ تو نہیں معلوم مرزا یا محلّہ کا کوئی عیّار۔ ٹوپی۔ جوتی۔ رومال۔ چھڑی۔ تکیہ۔ دری یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے منفک اور اُس کے جسم سے جدا تھی۔ لے کر چمپت ہوا۔ یوں ہی کلیم بہت دیر کو سو کر اُٹھتا تھا اور آج تو ایک خاص وجہ تھی کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا۔ تو دیکھتا کیا ہے کہ فرشِ مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلبِ ماہیت ہو کر میں بھتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا کہیں پتہ نہیں۔ مسجد تھی ویران اُس میں پانی کہاں! صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ اِدھر کو آ نکلے تو اُس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں اور یا منھ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں۔ اِس میں دوپہر ہونے آئی بارے! ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا۔ جوہیں زینہ پر چڑھا۔ کہ کلیم عرضِ مطلب کے لئے لپکا وہ لڑکا اُس کی ہیئت کذائی دیکھ ڈر کر بھاگا۔ خدا جانے اُس نے

اُس کو بھوت سمجھا۔ یا سڑی خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا۔ اُس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔ ناچار کلیم نے بہزار مصیبت دوسرے فاقے سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا تو اُلّو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا۔ سید ھا مرزا کے مکان پر گیا۔ آواز دی۔ تو یہ جواب ملا کہ "وہ بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں"۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کرکے ممکن ہو تو منہ دھونے کو پانی مانگے۔ اور مرزا کی پھٹی پُرانی جوتی اور ٹوپی تا کہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے۔ یہ سوچ کر اُس نے کہا "کیوں حضرت! آپ مجھ سے بھی واقف ہیں۔ اندر سے آواز آئی کہ "ہم تمھاری آواز تو نہیں پہچانتے۔ اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو"۔ کلیم۔ میرا نام کلیم ہے اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بہت دوستی ہے بلکہ میں کل شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔

گھر والے۔ وہ دری اور تکیہ کہاں ہے۔ جو رات تمھارے سونے کے لیے بھیجا گیا تھا تکیہ اور دری کا نام سُن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں متامل تھا کہ اندر سے آواز آئی "مرزا زبردست بیگ دیکھنا! یہ مردوا کہیں چل نہ دے دوڑ کر تکیہ اور دری تو اس سے لے لو"۔ کلیم یہ بات سُن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہونچا تھا۔ کہ زبردست نے چور چور کرکے جا لیا۔ ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ظاہر کیے مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ اُس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔

کلیم کوتوالی میں

کوتوال نے سرسری طور پر دونوں کا بیان سُنا۔ اور کلیم سے اُس کا حسب نسب پوچھا ہر چند کلیم اپنا پتہ بتانے میں جھیپتا تھا۔ مگر چار وناچار اُس کو بتانا پڑا۔ لیکن اُس کی حالتِ ظاہری ایسی اَبتر ہو رہی تھی کہ اُس کا سچ بھی جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔ کوتوال نے سُن کر یہی کہا کہ "میاں نصوح جن کو تم اپنا والد بتاتے ہو۔ میں اُن کو خوب جانتا ہوں اور یہ بھی مجھ کو معلوم ہے کہ اُن کے بڑے بیٹے کا یہی نام ہے۔ جو تم نے اپنا بیان کیا محلہ کا پتا گھر کا نشان جو تم نے کہا سب ٹھیک ہے۔ مگر کلیم تو ایک مشہور و معروف آدمی ہے۔ آج شہر میں اُس کی شاعری کی دھوم ہے۔ تمھاری یہ حیثیت کہ ننگے سر ننگے پاؤں۔ بدن پر کیچڑ تھپی ہوئی۔ مجھ کو باور نہیں ہوتا اچھّا اب رات کو کیا ہو سکتا ہے۔ جرم سنگین ہے ان کو حوالات میں رکھّو صبح ہو۔ میں اِن کے والد کو بُلواؤں۔ تو اِن کے بیان کی تصدیق ہو۔"

کلیم یہ سُن کر رو دیا۔ اور کہا "میں وہی بدنصیب ہوں جس کی شعرگوئی کا شہرہ آپ نے سُنا ہے اور آپ کو یقین نہ ہو۔ تو میں اپنے افکارِ تازہ آپ کو سُناؤں۔" چنانچہ کل شب کو جو کچھ مسجد اور مرزا کی شان میں کہا تھا سُنایا۔ اِس پر کوتوال نے اتنی رعایت کی۔ کہ دو سپاہی کلیم کے ساتھ کیے اور اُن کو حکم دیا کہ "اِن کو میاں نصوح کے پاس لے جاؤ۔ اگر وہ

ان کو اپنا فرزند بتائیں۔ تو چھوڑ دینا۔ ورنہ واپس لاکر حوالات میں قید رکھنا۔"

کلیم کا باپ کے روبرو آنا

کلیم پر اِس کیفیت سے باپ کے روبرو آنا جیسا کچھ شاق گذرا ہوگا ظاہر ہے مگر کیا کر سکتا تھا۔ سپاہی اُس کو کشاں کشاں لے ہی گئے محلّہ کی مسجد جس میں نصوح نماز پڑھا کرتا تھا۔ اُس کے گھر سے بہت قریب تھی۔ صحن میں ایک شاداب چمن تھا۔ اور چمن کے بیچوں بیچ میں ایک مرتفع چبوترہ عجیب تفریح کا مقام تھا۔ نصوح بیشتر نماز عشا کے بعد خصوصاً چاندنی راتوں میں اُس چبوترہ پر بیٹھ کر پھول بوٹوں میں خداوند تعالیٰ کی صنعت کا ملاحظہ کیا کرتا تھا۔ اُس کو بیٹھا دیکھ کر دوسرے نمازی بھی جمع ہو جاتے تھے اور نصوح کو وعظ و پند کے طور پر اُن کے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا۔

نصوح اور اُس کے مستمعین مسجد کے چبوترہ پر جمع ہو چلے تھے کہ کوتوالی چبوترہ کے سپاہی کلیم کو لیے ہوئے آ پہونچے۔ یہ اتفاق منجانب اللہ شاید اِس وجہ سے پیش آیا۔ کہ جو لوگ کلیم کی نظر میں صرف اِس وجہ سے ذلیل تھے کہ وہ اپنے خالق کی پرستش کرتے تھے۔ اُن کے سامنے اُس کی گردن نخوت نیچی ہو۔ اب وہ اُنھیں قُلاؤزیوں اور مُردہ شویوں اور بھک منگوں اور ٹکر گداؤں کے روبرو اِس حیثیت سے کھڑا تھا کہ منکر نکیر کی طرح دو سپاہی

اُس کی گردن پر سوار تھے۔ نہ سر پر ٹوپی۔ نہ پاؤں میں جوتی۔ دو وقت کے فاقے سے مُنہہ سُوکھ کر ذری سا نکل آیا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں۔ کپڑوں کا وہ حال تھا کہ ایسے لباس سے ننگا ہوتا تو بہتر تھا۔ جوں نصوح کی نظر بیٹے پر پڑی۔ گویا ایک تیر سا کلیجے میں لگ گیا اگر پہلا سا نصوح ہوتا۔ تو نہیں معلوم عورتوں کی طرح ڈھاڑیں مار کر روتا یا سر پیٹنے لگتا۔ یا دَوڑ کر بیٹے کو لپٹ جاتا۔ یا سپاہیوں سے بے پوچھے گچھے دست و گریبان ہو پڑتا۔ خدا جانے اِضطرابِ جاہلانہ میں کیا کرتا۔ مگر اب اُس کی جملہ حرکات و سکنات معلِم دینداری کی مطیع اور مؤدّب خدا پرستی کی تابع تھیں۔ اُس نے ایک دمِ سرد بھر کر اِنّا للّٰہ و اِنّا الیہ راجعون تو کہا اور اُف بھی نہ کی۔ سپاہیوں نے اُس سے کلیم کی نسبت پوچھا تو اُس نے آنکھیں نیچی کر کے کہا کہ "جب حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کو ڈوبتے دم تک بیٹا بیٹا پکارتے گئے تو میں اس کے فرزند ہونے سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں"

سپاہی تو اِتنا سُن کر رخصت ہوے اور کلیم کو رُفقاے نصوح میں سے کسی نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھایا۔

باپ کی نصیحت

نصوح بیٹے کی طرف مخاطب ہو کر بولا کیوں کلیم! میں نے ایسا کون سا قصور کیا تھا کہ تم کو میری طلعتِ منحوس تک دیکھنی گوارا نہوئی۔ تم اِس بات سے

انکار نہیں کرسکتے۔ کہ شفقتِ اولاد ماں باپ کی طبیعت میں مُخمّر اور اُن کی جبلّت میں داخل ہے۔ وہ شفقت جو اس وقت مجھ کو اس بات کی محرک ہوئی کہ میں سپاہیوں کے پنجے سے تمھاری نجات کا باعث ہوا۔ وہی شفقت مجھ کو اس بات پر بھی مجبور کرتی تھی اور کرتی ہے اور کرے گی کہ میں تم کو ایسی راہ نہ چلنے دوں۔ جو تمھاری ابدی ہلاکت کا باعث اور دائمی تباہی کا موجب ہو۔ میں نے تم سے نہیں کہا کہ "میرے لئے کمائی کرو۔ میری آسایش کے واسطے اپنے اوپر تکلیف اُٹھاؤ"۔ اگر میں ایسا کہتا بھی تو مجھ کو اس کا منصب اور حق تھا۔ میں نے جس کمائی کو کہا۔ وہ تمھارے ہی کام آوے گی اور جس محنت کی تم کو تکلیف دی وہ تمھیں کو آرام دے گی۔ اگر کسی بیمار کا طبیب مہربان سے پرہیز کرنا۔ کسی سیّاح کا بدرقۂ خیرخواہ سے گریز کرنا روا ہے تو بے شک تم بھی مجھ سے نفرت رکھ سکتے ہو۔ کیوں کلیم؟ کیا ہمیشہ تمھاری خوشی مجھ کو منظور۔ تمھاری رضاجوئی مجھ کو ملحوظ نہیں رہی اب جو تم نے مجھ کو اپنا دشمن قرار دیا۔ اپنا عدو ٹھہرایا تو دشمنی کا سبب؟ عداوت کا موجب؟

میں نے سُنا ہے کہ تم مجھ کو دیوانہ اور مجنون اور مختل الحواس تجویز کرتے ہو۔ سو میں اس تشخیص صحیح اور تجویز درست اور اس فراستِ صائب پر جرح نہیں کرتا۔ میں باؤلا اور سڑی اور پاگل سہی۔ لیکن اگر کوئی باؤلا

تمہاری راہ میں کانٹے پڑے دیکھ کر تم کو آگاہ کرے۔ تو کیا اُس کی بات نہ سُننا۔ اُس کی نصیحت کو نہ ماننا۔ اُس کی فریاد کی طرف ملتفت نہ ہونا شیوۂ دانشمندی ہے؟ پھر تم کو یہ بھی سوچنا چاہیئے تھا اور چاہیئے ہے کہ آیا میں اکیلا اِس جنون میں مُبتلا ہوں۔ یا اور بندگانِ خُدا بھی میری ہی سی رائے، میرے ہی سے خیالات، رکھتے ہیں کلیم میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ کہ جتنے بزرگانِ دین ہو گذرے ہیں (خدا اُن کی پاکیزہ اور مُطہر روحوں پر رحمتِ کاملہ نازل کرے) اور جتنے نیک بندے اب موجود ہیں (خدا اُن کی حیات میں برکت دے) کوئی اِس جنون سے خالی نہیں۔ بلکہ جس کو جتنا یہ جنون زیادہ اُسی قدر برگزیدہ اور خدا رسیدہ زیادہ۔ کیا اِس بات کا اقرار کرنا جنون ہے کہ ہم بندے ہیں اور اُس کا بھی ہم پر کچھ حق ہے جس نے ہم کو پیدا کیا۔ جو ہم کو روزی دیتا ہے۔ جس نے ہماری جانوں کی شادابی اور تازگی کے لئے آبِ شیریں وخوش گوار کی سوتیں زمین میں جاری کر رکھی ہیں اور ہماری روحوں کے اِنبساط کے لئے ہوا کا ذخیرہ کافی مہیّا فرما دیا ہے۔ جس کے حکم سے چاند سورج اپنے معمول سے نکلتے اور غروب ہوتے ہیں۔ تاکہ کام کرنے کے لئے دِن ہو اور آرام لینے کے لئے رات جس نے دنیا کے قوی ہیکل اور زبردست جانوروں کو ہمارا مطیع ومنقاد بنا دیا ہے کہ اُن سے ہم سواری لیتے اُن پر ہم اپنا

بوجھ لادتے اُن کے گوشت اور پوست اور دُودھ سے مُستفید ہوتے ہیں
جس نے اِنسان کو گویائی اور بیان کی قوّت عطا کی ہے جس کے ذریعے
سے وہ اپنا ما فی الضمیر اپنے ابنائے جنس پر ظاہر کر سکتا ہے جس نے
اِنسانِ ضعیفُ البُنیان کو عقل کی قوّت اور دانش کی طاقت دے کر
روے زمین کا بادشاہ اور مخلوقات کا حاکم بنایا ہے۔ جس نے کائنات
میں سے ہر موجود کو اُس کی مناسب حالت پر خلق کیا ہے۔ اگر دنیا کے
سارے درخت قلموں میں صرف کر دیے جائیں اور ساتوں سمندر کا پانی سیاہی کی
جگہ کام میں لایا جائے اور پڑھے لکھّے لوگ جِتنے اِبتدائے آفرینش سے اب تک
ہو چکے اور اب موجود ہیں اور آیندہ پیدا ہونے والے ہیں سب کے سب
مِل کر اُس کی تعریف، اُس کے احسانات۔ اُس کے انعامات روزِ قیامت
تک بیٹھے لکھا کریں۔ تو گھِستے گھِستے درخت ہو چکیں۔ سمندر سوکھ جائیں۔ لکھنے والے
تھک کر بیٹھ رہیں۔ مگر اُس کے حقِّ واجب کا ایک عُشرِ عشیر بھی
ادا نہ ہو۔ کلیم! فنا ایک ایسی بدیہی بات ہے۔ کہ دُنیا میں کوئی اُس کا
منکر نہیں اور نہ اُس سے انکار ممکن ہے۔ ہیضہ کی وبا دفع ہوئے برس نہیں
گذرے تمھارے دیکھتے دیکھتے کیسے کیسے لوگ ہٹّے کٹّے توانا۔ اچھے بھلے چلتے
پھرتے۔ امیر و غریب۔ عالم و جاہل۔ بھلے بُرے۔ سبھی طرح کے صدہا
ہزارہا ہدفِ تیرِ قضا ہو گئے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ وبا پر کیا منحصر ہے

"وعدے سے دم زیادہ نہ کم"۔ مرنا برحق۔ اچھا پھر مرے پیچھے کیا ہوگا!
وہی عقیل ہے۔ وہی فہیم۔ وہی زیرک۔ دانشمند۔ جو اس سوال کا
جواب معقول دے۔ جو اس معمّے کو حل کرے۔ جو یہ پہیلی بُوجھے
کلیم! اِنسان کی خاص طرح کی خلقت۔ یعنی اس کا وجود عاقل ہونا
اِس بات کا مقتضی ہے کہ ضرور اُس سے کوئی بڑی خدمت متعلق
اور اُس کے ذمّے زیادہ جواب دہی ہے۔ اگر اُس کا صرف یہی
کام ہوتا کہ پیٹ بھر لے اور سُو رہے اور گرمی سردی سے اپنے تئیں
بچائے تو اُس کے لئے زیادہ عقل کی ضرورت نہ تھی جانور اپنے بڑے
بڑے جُثّوں کی پرداخت پر بخوبی قادر ہیں حالانکہ عقل سے بے بہرہ
اور دانش سے بے نصیب ہیں۔ پس اِس خدمت اور ذمّہ داری کا
دریافت کرنا شرط انسانیت ہے"!

نصوح کا وعظ سُن کر اُس کے ہمراہیوں کے دلوں میں دینداری
کے ولولے اور خداپرستی کے جوش تازہ ہوگئے۔ حاضرین میں کلیم کے
سوائے کوئی متنفس نہ تھا۔ کہ جس پر تھوڑی یا بہت رِقّت طاری
نہ ہوئی ہو۔

از شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی

سرسیّد احمد خاں مرحوم کی اِنشا پردازی

چونکہ سرسیّد سے قوم کی اصلاح کا عظیم الشّان کام ظہور میں آنا تھا اِس لئے خدائے تعالیٰ نے اُن کی ذات میں وہ تمام خاصیتیں جمع کردی تھیں جو ایک رفارمر میں ہونی ضرور ہیں، اُنھیں خاصیتوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ابتدا سے تحریر یا تقریر میں تصنّع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے، اور گرامر کی پابندی سے فطرۃً آزاد تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے جو اوّل اوّل دلّی میں اپنے گِرد شعرا کا جمگھٹا دیکھ کر اُن کی دیکھا دیکھی شعر کہنا شروع کیا تھا، کچھ بہت دن نہ گذرے کہ وہ اُن تکلّفاتِ لایعنی سے جو شاعری کے لئے لازم ہیں، اور حقائق نگاری میں مُخِل ہوتے ہیں۔ ہمیشہ کے لئے دست بردار ہوگئے۔ اُنھوں نے **سیرت فریدیّہ** میں اپنے بچپن کا حال لکھا ہے۔ کہ اُن کے نانا نے جب کہ وہ بوستاں پڑھتے تھے۔ اُن کا سبق سُنا۔ سبق میں وہ شعر بھی تھا جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے:۔ "طمع را سہ حرف ست ہر سہ تہی" اُنھوں نے اِس کا ترجمہ کیا کہ "طمع کے تین حرف تینوں خالی" نانا نے تین دفعہ ٹوکا اور بہت خفا ہوئے مگر یہ وہی معنی کہے گئے،

چونکہ محاورہ کے موافق ترجمہ یہی فصیح تھا، اس لئے گرمر کا مطلق خیال نہ آیا۔ جو حال اُن کا اُس بچپن کے زمانے میں تھا وہی اخیر دم تک باقی رہا۔ وہ تحریر یا تقریر کی رَو میں گرمر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے، وہ اُن قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرّر کی ہیں بالکل آزاد تھے، وہ اُن غلط لفظوں کو جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہوں، صحیح الفاظ پر ترجیح دیتے تھے، اُن کی زبان دلّی کی بول چال میں محدود نہ تھی، بلکہ جو لفظ یا جو جملہ بے اختیار قلم سے ٹپک گیا۔ وہی اُن کی زبان اور وہی بول چال تھی، غالباً اُنھوں نے کسی لفظ کے استعمال کرتے وقت یہ خیال نہ کیا ہوگا کہ یہ لفظ اہل زبان بولتے ہیں یا نہیں؟ اور کسی فقرہ کو لکھ کر پھر یہ نہ دیکھا ہوگا کہ قواعد کی رو سے اُس کی ترکیب صحیح ہے یا نہیں؟

یہ خاصیّت جس کو ہم نے بیان کیا ایک سچّے رفارمر کے کلام میں ایسی ہی ضروری ہے جیسی سچّائی اور راستبازی۔ وہ مثل شاعروں اور انشاپردازوں کے اپنے کلام کی بُنیاد الفاظ کی شستگی اور ترکیبوں کی برجستگی پر نہیں رکھتا، بلکہ اُس بے قرار آدمی کی طرح۔ جو گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھ کر ہمسایوں کو بے تابانہ آگ بجھانے کے لئے پکارتا ہے ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے، جو گھبراہٹ کی حالت میں

بے ساختہ انسان کے منھ سے نکل جاتے ہیں۔ وہ واقعات پر تشبیہ و استعارہ کے پردے نہیں ڈالتا، بلکہ اُن کی ننگی تصویر کھلّم کھلّا سب پر ظاہر کرتا ہے وہ الفاظ و قواعد کا محکوم نہیں ہوتا، بلکہ الفاظ اور قواعد کو اپنے جذبات کا محکوم رکھتا ہے۔

الغرض سر سیّد نے خیالات کے ظاہر کرنے میں بناوٹ اور تصنّع کو کبھی دخل نہیں دیا، جس سادگی اور بے تکلّفی کے ساتھ ابتدا میں مطلب نگاری شروع کی تھی، غدر کے زمانہ تک جو کہ تقریباً بیس برس کا زمانہ ہوتا ہے، اپنے اُسی سیدھے سادے اور نیچرل اسٹائل میں ہر قسم کی تحریریں، کیا کتابیں، کیا مضامین اور کیا مقدّمات کے فیصلے اور تجویزیں برابر لکھتے رہے۔ اس بیس سال کی مشق و مہارت نے جو کہ ایک انداز پر متّصل جاری رہی، ضرور ہے کہ اُن کے قلم میں ہر مطلب کے ادا کرنے اور ہر پیچیدہ مضمون کے سُلجھانے کی ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی ہوگی، کیونکہ نیچرل قویٰ سے جب اُن کے مقتضا کے موافق برابر کام لیا جاتا ہے، تو اُن سے اکثر فوق العادۃ کرشمے ظہور میں آتے ہیں۔ مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جب کہ اس سیدھی سادی تحریر کے اصلی جوہر کھلنے والے اور اس ٹھنڈی آگ کے شعلے بلند ہونے والے تھے۔

غالبًا اِس بات پر سب کا اِتّفاق ہوگا کہ تحریر یا تقریر کا اصلی مقصد لوگوں کے دِلوں پر اثر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر اِس اَمر میں سب کی رائے مختلف معلوم ہوتی ہے کہ اثر کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اِسی ایک مقصد کے لئے کوئی الفاظ میں تراش خراش اختیار کرتا ہے اور کوئی سادگی، کوئی کلام کی بُنیاد متانت اور سنجیدگی پر رکھتا ہے اور کوائی مزاح وظرافت پر، کوئی سُوچ سُوچ کر عِلمی اصطلاحیں اور فاضلانہ ترکیبیں استعمال کرتا ہے اور کوئی ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اہلِ زبان کے محاورے اور روز مّرے بہم پہونچاتا ہے، اِسی طرح کوئی کِسی ڈھنگ پر چلتا ہے اور کوئی کِسی طریقہ پر۔ مگر حق یہ ہے کہ کلام کی تاثیر کو اِن باتوں سے کچھ علاقہ نہیں۔

بے شک کلام کے مُوثر ہونے کے لئے اُس کا سادہ اور بے تکلّف ہونا ضرور ہے۔ مگر اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام سادہ اور بے تکلّف ہوگا، وہ مؤثر بھی ضرور ہوگا۔ کلام کیسا ہی سادہ اور بے تکلّف ہو۔ جب تک کہ متکلّم کا دل آزادی اور سچّائی سے بھرا ہوا نہ ہو۔ کبھی مُوثر نہیں ہوسکتا۔ جس طرح تلوار کا کاٹ۔ درحقیقت اُس کی باڑھ میں نہیں۔ بلکہ سپاہی کے کرتبی ہاتھ میں ہے، اِسی طرح کلام کی تاثیر اُس کے الفاظ میں نہیں بلکہ متکلّم کی سچّائی اور اُس کے نڈر دل اور بے لاگ زبان

ہیں ہے۔ وہی الفاظ جو ایک سچّے اور دل سوز ناصح کی زبان سے
نکل کر لوگوں کے دلوں پر تیر و سنان کا کام کرتے ہیں، ممکن نہیں کہ
ایکؔ نمائشی واعظ کی زبان پر اُن میں کچھ بھی اثر باقی رہے۔ سچّے ناصح
کے لعن و طعن میں جو اثر ہوتا ہے، وہ جھوٹے واعظ کی بشارتوں میں
نہیں ہوتا۔ سرسیّد کے کلام میں جو تاثیر تھی، وہ درحقیقت اُن کی سچّائی اور
حق گوئی کا نتیجہ تھا۔

باوجودیکہ مسلمان صدہا سال سے نہ صرف مذہب میں بلکہ علوم و فنون
میں، لٹریچر میں، رسم و رواج میں، اَخلاق و عادات میں، طریق معاشرت میں
غرضکہ ہر چیز میں اگلوں کی لکیر پر فقیر چلے آتے تھے، اور کوئی ایسی بات
جس سے کبھی اُن کے کان آشنا نہ ہوئے ہوں۔ ہرگز سننی نہیں چاہتے
تھے۔ مگر سچ میں وہ کرشمہ ہے کہ تاریکی میں بھی وہ چمکے بغیر نہیں رہتا
جو شخص سب سے پہلے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر اور سوسائٹی کی رکاوٹوں کو
برطرف کرکے قوم کی اصلی بھلائی کے خیالات صاف صاف ظاہر کرتا ہے
گو وہ قوم کے مذاق اور الف و عادت کے کیسے ہی برخلاف ہوں اُن میں
عجیب قسم کی کشش ہوتی ہے کہ اُن کے سننے کے لئے کیا موافق اور کیا
مخالف سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور دونوں فریق مختلف طور پر
اُن سے متاثّر ہوتے ہیں، پہلا اُن کو حق سمجھ کر بے چون و چرا قبول

کرتا ہے اور دوسرا اُن میں مقبولیت کے آثار نمایاں دیکھ کر خائف ہوتا ہے کہ مُبادا یہ خیالات تمام قوم میں شایع ہو جائیں۔ سرسیّد کی تحریر میں یہی چیز تھی جس نے اُن سیدھے سادے اور معمولی لفظوں میں جادو کا سا اثر پیدا کر دیا تھا، اور تمام قوم میں ہل چل ڈال دی تھی،

مگر اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سرسیّد کی تحریر جو بظاہر متعارف لفظی خوبیوں سے خالی معلوم ہوتی تھی درحقیقت اُس میں لفظی خوبیاں نہ تھیں بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ جب عمدہ اور پاکیزہ خیالات ایسے صاف اور معنی خیز لفظوں میں بیان کیے جاتے ہیں کہ لفظ کے ساتھ ہی ساتھ معنی بھی ذہنوں میں اُترتے جاتے ہیں، تو خیالات کی خوبی ناظرین کو الفاظ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی، کیونکہ محاسن لفظی خیالات کے شکوہ میں دب جاتے ہیں۔ اِس کے سوا جب مصنّف کی ہمّت محض عمدہ خیالات کے پھیلانے پر مقصور ہوتی ہے۔ تو اُس کے بیان میں محاسن لفظی کی اُسی قدر گنجایش ہوتی ہے۔ جس قدر کہ ہر مقام کا مقتضا ہوتا ہے اور اس لئے وہ عبارت میں اِس قدر گھُل مل جاتے ہیں کہ جب تک بہ نظر غور نہ دیکھا جائے۔ عام بیان اُن سے سادہ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسیّد کی تحریر میں لفظی خوبیاں ایسی اُجاگر نہیں معلوم ہوتیں، جیسی دیگر مصنّفوں کے کلام میں معلوم ہوتی ہیں۔ ورنہ صنائع لفظی کے

سوا اُس میں تمام محاسن لفظی و معنوی موجود ہیں تشبیہیں بھی ہیں۔ استعارے بھی ہیں، کنائے بھی ہیں، تمثیلیں برجستہ اور تلمیحیں نہایت لطیف ہیں۔ بذلے اور لطیفے حد سے زیادہ دلکش اور دلفریب ہیں، کہاوتیں۔ اور اشعار برمحل، جابجا نظر آتے ہیں۔ مگر اس قبیل کی جو چیز ہے۔ اُس میں ایسا بے ساختہ پن پایا جاتا ہے کہ گویا بے قصد و بے ارادہ مصنّف کے قلم سے ٹپکی ہے۔

مگر جو چیز کہ سرسیّد اور دیگر مصنّفوں اور مضمون نگاروں میں مابہ الامتیاز ہے وہ قدرتِ بیان ہے۔ جس کے ثبوت کے لئے خود اُن کی مختلف تحریروں کا دیکھ لینا کافی ہے مُصنّف کی قدرتِ بیان کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ ہر ایک مضمون کو اسی پیرایہ میں بیان کر سکے جو اُس مضمون کی حالت کے مناسب ہے۔ کیونکہ ہر قسم کے کلام کا پیرایۂ بیان جُدا ہوتا ہے۔ جس ڈھنگ پر ناول لکھا جاتا ہے اُس ڈھنگ پر تاریخ یا بائیوگرفی نہیں لکھی جاتی، جہاں متانت اور سنجیدگی کا موقع ہوتا ہے۔ وہاں ظرافت نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ اگرچہ نظم و نثر کا زیور ہے۔ مگر کسی سررشتہ کی سالانہ رپورٹ، یا کسی مقدمہ کے فیصلہ یا کسی پبلک جلسہ کی روئداد میں اُس سے زیادہ کوئی چیز بدنما نہیں ہوتی۔ اسی لئے کہا گیا ہے "ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد"

مگر جہاں تک دیکھا جاتا ہے، ہر مصنّف پر اُس کی طبیعت کے میلان کے موافق رفتہ رفتہ کسی خاص پیرایۂ بیان کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ ایک خاص مضمون کے سوا اور کسی موضوع پر کچھ نہیں لکھ سکتا، اور یا جس موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے، اُس کو اُسی خاص رنگ میں رنگنا چاہتا ہے، مثلاً بعضوں کا قلم حسن و عشق کے میدان میں خوب دوڑتا ہے۔ پس یا تو وہ ایسے مضمون پر قلم ہی نہیں اُٹھاتے، جس میں حسن و عشق کی چاشنی نہ ہو، اور یا جو مضمون لکھتے ہیں۔ اُس کو اُسی سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اِسی طرح بعض کی طبیعت پر استعارہ اِس قدر غالب ہوتا ہے، کہ سیدھے رستے سے بھی چکّر کاٹے بغیر نہیں گذرتے۔ بعضے ہر ایک مضمون میں ظرافت کی چاشنی دینی چاہتے ہیں، اگرچہ نفسِ مضمون اُس سے اِبا کرتا ہو۔ غرض کہ جس مصنّف یا مضمون نگار کو دیکھیے، اُس پر کوئی نہ کوئی بھوت سوار ہوتا ہے۔

مگر سر سید کی تحریروں کو ہم اِس عام قاعدہ سے مستثنےٰ پاتے ہیں۔ اُس کی ہر قسم کی بے شمار تحریریں، کیا تاریخی، کیا علمی، کیا مذہبی، کیا اخلاقی، کیا سوشل، کیا پولٹیکل، کیا افشل۔ اور کیا لیگل، جو علیگڈھ گزٹ تہذیب الاخلاق و تصانیف احمدیہ، سالانہ رپورٹوں۔ عدالت کے فیصلوں، جلسوں کی روئدادوں، اور پرائوٹ خطوط وغیرہ میں موجود ہیں

اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک شاخ میں وہی پیرایۂ بیان پایا جاتا ہے جو اُس کے لئے موزوں اور مناسب ہے، حالانکہ مصنّف کو خود خبر نہیں کہ کس مضمون کے لئے کون سا پیرایۂ بیان موزوں ہے، مگر تحریر کی قدرتی قابلیت بغیر قصد و ارادہ کے قلم کو اُسی راہ پر ڈال دیتی ہے جس پر اُس کو چلنا چاہیے، جس طرح پہاڑ کی ندی رستے کے موڑ توڑ اور پیچ و خم کے ساتھ رُخ بدلتی چلی جاتی ہے؛ اسی طرح ہر مقام کے مقتضیٰ کے موافق تحریر کا رنگ خود بخود بدل جاتا ہے۔ اگر علمی اور تاریخی مضامین میں دریا کے بہاؤ کی سی روانی ہے، تو مذہبی اور پولٹیکل تحریروں میں چڑھاؤ کی تیرائی کا سا زور ہے۔ اعتراضات کے جواب میں متانت اور سنجیدگی ہے تو بے دلیل دعوؤں کے مقابلہ میں ظرافت و خوش طبعی نصیحتیں، نشتر سے زیادہ دل خراش اور مرہم سے زیادہ تسکین بخش ہیں، غصّہ مہربانی سے زیادہ پُر لطف ہے اور نفرین آفرین سے زیادہ خوش آئندہ، وہی ایک قلم ہے جو اخلاق کے بیان میں ایک مورلسٹ کے ہاتھ میں معلوم ہوتی ہے تو عدالت کے فیصلوں میں ایک کہنہ مشق جج کے ہاتھ میں، اور سالانہ رپورٹوں اور جلسوں کی روئدادوں میں ایک تجربہ کار سکرٹری کے ہاتھ میں۔

واقعات و حالات کے حُسن و قبح کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ جو

بُرائیاں بسبب اِلفت وعادت کے دِلوں میں کھُپ گئی ہوں اُن کی بُرائی اور جو خوبیاں سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چھُپ گئی ہوں اُن کی خوبی، فوراً دِلوں پر نقش ہو جائے، یہ کمال بھی جو سرسیّد کی تحریر میں دیکھا جاتا ہے، دوسری جگہ آج تک نہیں دیکھا گیا اور اُس کی مثالیں خاص کر تہذیب الاخلاق کی قدیم اور جدید جِلدوں میں بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً وہ ایک آرٹیکل میں مسلمانوں کے کھانا کھانے کا طریق اِس طرح بیان کرتے ہیں:۔

ہندوستان میں مُسلمانوں کے کھانا کھانے کا بھی وہی طریق ہے جو ہندوؤں کا ہے، صرف اِتنا فرق ہے کہ ہندو چوکے میں بیٹھتے ہیں مسلمان دسترخوان بچھا کر بیٹھتے ہیں۔ جس طرح ہندو سب طرح کا کھانا ایک ساتھ اپنے آگے رکھ لیتے ہیں۔ اِسی طرح مسلمان بھی قابوں اور رکابیوں اور غوریوں اور تشتریوں اور پیالوں میں سب طرح کا کھانا اور سب قسم کی روٹی اور ہر طرح کے کباب اور فیرنی کے خونچے اور بُورانی کے پیالے اور اچار، مربّے کی پیالیاں سیتلا کے پُوجاپے کی طرح سب اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اور اُس ایک دسترخوان پر کوئی فیرنی کلمۂ شہادت کی اُنگلی سے اور کوئی (دستِ پنجہ) چاروں اُنگلیوں سے چاٹ رہا ہے۔ کوئی پلاؤ میں اروی کا سالن مِلا مِلا کر کھا رہا ہے، کسی نے سالن رلا ہوا

پُلاؤ کھا کر نان آبی سے لتھڑا ہوا پنجۂ مبارک پونچھکر روٹی کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے، کسی نے بُورانی کے پیالے کو مُنھ سے لگا کر سڑّپا بھرا اور یہ کہہ کر واللہ بڑی تیز ہے! آوہ اُوہ کرنا شروع کیا ہے تمام جھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا اور چچوڑی ہوئی ہڈّیاں اور روٹی کے ٹکڑے اور سالن میں کی نکلی ہوئی مکھیّاں سب آگے رکھّی ہوئی ہیں، اِس عرصہ میں جو شخص پہلے کھا چکا ہے، اُس نے ہاتھ دُھونا، کھنکار کھنکار کر گلا صاف کرنے اور بیسن سے دانت رگڑنے اور زبان پر دو اُنگلیاں رگڑ رگڑ کر صاف کرنا شروع کیا ہے اور اور بے تکلّف بیٹھے کھانا نوش فرماتے ہیں۔ نہ اُن ہاتھ مُنھ دُھونے والوں کو خیال ہے کہ ہم کھانا کھانے والوں کے قریب کیسی حرکات ناشایستہ کرتے ہیں اور نہ کھانا کھانے والوں کو اُن لوگوں کی کریہ آواز سُننے اور زرد زرد ہلدی ملے ہوے رنگ کا لعاب نکلنے اور بلغم کے لُوتھڑے تھُو تھُو کر کے چلمچی یا تاش میں تھوک دینے اور بتاسے کی طرح اُس کے پانی پر تیرتے پھرنے کی پروا ہے نعوذ باللہ منہا!!"

یا مثلاً ایک آرٹکل میں بے تہذیب آدمیوں کی بحث و تکرار کی تصویر اِس طرح کھینچی ہے:-

"جب کٹّے آپس میں مِل کر بیٹھتے ہیں۔ تو پہلے تیوری چڑھا کر

ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گنجیلی آواز اُن کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا جبڑا کھُلتا ہے اور دانت دِکھائی دینے لگتے ہیں، اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چِر کر کانوں سے لگ جاتی ہیں، اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں، اور عنیف آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور ایک دُوسرے سے چمٹ جاتے ہیں، اِس کا ہاتھ اُس کے گلے میں، اور اُس کی ٹانگ اِس کی کمر میں۔ اِس کا کان اُس کے منہ میں، اور اُس کا ٹینٹوا اِس کے جبڑے میں۔ اِس نے اُس کو کاٹا۔ اور اُس نے اِس کو پچھاڑ کر بھبوڑا، جو کمزور ہوا، دُم دبا کر بھاگ نکلا۔"

نامہذّب آدمیوں کی مجلس میں بھی اِسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مِل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے، ایک کوئی بات کہتا ہے؛ دوسرا بولتا ہے، واہ! یوں نہیں، یوں ہے، وہ کہتا ہے؛ واہ! تم کیا جانو، وہ بولتا ہے تم کیا جانو، دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے؛ تیوری چڑھ جاتی ہے، آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں، باچھیں چِر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے

ہیں۔ تھوک اُڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں سانس جلدی چلتا ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ، ناک، بھوں اور ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں، آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا، اُس کی گردن اِس کے ہاتھ میں اور اِس کی داڑھی اُس کی مٹھی میں، لپّاڈگّی ہونے لگتی ہے اگر کسی نے بیچ بچاؤ کر چھڑا دیا تو غرّاتا ہوا ایک اُدھر چلا گیا، ایک اِدھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا، تو کم زور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔ جس قدر تہذیب میں ترقّی ہوتی ہے، اُسی قدر اِس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں تو تکرار تک نوبت آجاتی ہے کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتّوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے، پس اِنسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتّوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔“

از مسٹر محمد محمود سیفی (علیگ)

مرزا کا خواب

اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ کے موافق، میرا معمول تھا کہ چاند کی ہر پانچویں تاریخ دُنیا وی علائق اور کاروبار سے ایک سوئی حاصل کرکے سارے دن ریاضت وعبادت میں مصروف رہتا۔

ایک دن حسبِ معمول کہ پانچویں تاریخ تھی، صبح سویرے غسل و وضو کیا اور نماز صبح سے فراغت پاکر بغداد کے پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر چڑھ گیا، تاکہ دن کا باقی حِصّہ کسی گوشۂ تنہائی میں معتکف ہو کر مراقبہ اور یاد الٰہی میں بسر کروں۔ قلۂ کوہ پر عالم تنہائی میں نسیم سحری کے نرم نرم جھونکوں کا لُطف اُٹھا رہا تھا کہ اِنسان کی ہستی کے ہیچ اور ناپائدار ہونے کے خیالات دل میں خطور کرنے لگے اور یہی سمجھ میں آیا "اِنسان کچھ بھی نہیں۔ ایک سایہ ہے۔ اور زندگی صرف خواب ہے" ~~~

زندگی اپنی خواب کی سی ہے	یہ نمایش سُراب کی سی ہے

انھیں خیالات میں مُستغرق تھا، سر اُٹھا کر آنکھ جو کھولتا ہوں تو

سامنے والی چٹّان پر ایک آدمی گڈریے کے لباس میں خاموش کھڑا ہے اور ہاتھ میں ایک چھوٹی سی خوبصورت بانسری ہے۔ آنکھوں کا چار ہونا تھا کہ اُس نے بانسری ہونٹوں پر رکھکر بجانی شروع کر دی۔

میں کیا کہوں کہ وہ بانسری کا جان فزا اور شیریں ترانہ کس بلا کا تھا اُس کی دُھن اور لَے ہی کچھ نرالی تھی، ایسی سُریلی اور دل آویز صدائیں تو پہلے کبھی کانوں نے سنی ہی نہ تھیں ؎

کچھ سوز تھا کچھ گداز لَے میں		کچھ آگ بھری ہوئی تھی نَے میں

اِن رُوح پرور نغمات کے سُننے سے بہشت بریں کا وہ سماں آنکھوں میں پھر گیا۔ کہ جب نیک بندوں کی روحیں مرنے کے بعد وہاں داخل ہوتی ہیں۔ تو اُن کے خیر مقدم میں آسمانی فرشتے ایسے ہی باجے بجاتے ہیں، تاکہ اُن کی صوتِ جان نواز موت کی جان کنی کی آخری کلفتوں کو زائل کر دے۔ اور سُرور آبدی کے مقام میں رہنے کی صلاحیت اُن میں پیدا ہو جائے۔ میرا دل اندر ہی اندر اِس پوشیدہ خوشی کے مزے اُڑانے میں محو تھا۔

یہ تو مَیں نے سنا تھا کہ سامنے والی چٹّان ایک جن کا مسکن ہے اور بعض بعض راہگیروں نے جو اُس کے قریب سے ہو کر گذرے ہیں بانسری کے نغماتِ دلکش کا لُطف اُٹھایا ہے۔ لیکن آج تک یہ سُننے میں نہیں

آ یا تھا کہ اُس نئے نواز کی زیارت بھی کسی کو نصیب ہوئی۔

ان راحت فزا نغمات کو سُن کر میرے دل میں ایک عجیب سوز و گُداز پیدا ہو گیا اور ساتھ ہی یہ شوق دامنگیر ہوا کہ نئے نواز کی گفتگو سے فیضیاب ہونے کی مسرّت حاصل کرنی چاہیئے۔ اِس خیال کا دل میں آنا تھا کہ مَیں نے حسرت اور استعجاب کے ساتھ ایک نظر اُس کے چہرہ پر ڈالی۔

مجھے حیرت زدہ دیکھکر نئے نواز نے ہاتھ کے اِشارے سے اپنے قریب بُلایا۔ اِس وقت میرا دل شیریں نغمات سے مُتاثّر تھا۔ مَیں نہایت شوق اور ادب سے جن کے قریب گیا اور جھٹ پٹ اُس کے قدموں پر سر رکھ دیا اور لگا زار و قطار رونے۔

جن نے میری یہ حالت دیکھ کر رحم و الطاف کے ساتھ تبسّم کیا جس کی وجہ سے میری طبیعت اُس سے اور بھی مانوس ہو گئی، اور اُس کے اِس مُربّیانہ برتاؤ نے وہ خوف و خطر بھی دُور کر دیا جو اُس کے قریب جاتے وقت میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ اُس نے مجھے زمین سے اُٹھایا اور ہاتھ پکڑ کے کہا:۔

"مرزا! میں نے تیری باتیں، جو تو دل ہی دِل میں کر رہا تھا۔ سب سُن لی ہیں، آ میرے ہمراہ چل" مَیں اُس کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔

اب وہ مجھے پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا اور ایک بہت اونچے کنگرہ پر بٹھا کر بولا کہ "ذرا مشرق کی جانب نظر کر اور بتا کیا دکھائی دیتا ہے؟"

مَیں نے کہا "ایک عظیم الشان وادی ہے جس میں ایک زبردست سیلِ موّاج رواں نظر آتی ہے۔"

اُس نے کہا "یہ وادی جو تجھے نظر آتی ہے وادی مصائب ہے اور یہ سیلِ رواں ابدی سیلِ اعظم کا ایک جزو ہے۔"

میں نے پوچھا "یہ کیا بات ہے کہ وہ سیل جو مَیں دیکھ رہا ہوں۔ وادی کے ایک کنارے پر ایک گہرے کہر سے شروع ہوتا اور پھر ایک گہرے کہر میں دوسرے کنارے پر گم ہو جاتا ہے؟" کہا "جو کچھ تجھے نظر آرہا ہے یہ حصّہ ہے ابد کا جسے وقت کہتے ہیں، اور اُس کا اندازہ آفتابِ عالم تاب سے ہوتا ہے اور یہ ابتداے آفرینش سے تا روزِ قیامت ایسا ہی رہے گا"

اُس نے کہا "اب تو ذرا غور سے دیکھ، اور یہ سمندر، جو دونوں طرف تاریکی سے محدود ہے، بتا اِس میں کیا نظر آتا ہے؟"

مَیں نے کہا "سیل کے وسط میں ایک پُل نمودار ہے۔" کہا "یہ پُل عرصۂ حیاتِ انسانی ہے ذرا اِس کو خوب غور سے دیکھ" مَیں نے اطمینان کے ساتھ نظر جما کر جو دیکھا، تو تین اوپر تین بیسی سالم محرابیں دکھائی دیں اور چند محرابیں شکستہ بھی تھیں۔ اُن کو بھی شامل کر کے

شمار کیا تو پوری ستّو ہو گئیں میں ابھی گنتی ہی میں مصروف تھا کہ جن بولا
"پہلے اِس پُل میں پوری ایک ہزار محرابیں تھیں۔ ایک طوفانِ عظیم بہت
بڑے حصّہ کو بہالے گیا اور پُل کو اس تباہ حالت میں چھوڑ گیا جو بالفعل
نظر آتی ہے۔" پھر جن نے کہا کچھ اور بھی دکھائی دیتا ہے؟"
میں نے کہا "ہاں اُس پُل کے دونوں سِروں پر ایک ابرِ سیاہ ہے
کہ معلق نظر آتا ہے اور آدمی ہیں کہ جَیل کے جَیل پُل پر سے گذر
رہے ہیں۔"

جُوق جُوق مسافر پُل پر سے اُس سَیلِ عظیم کے اندر بھی جو اُس کے
نیچے پڑا بہہ رہا ہے، گرتے چلے جاتے ہیں۔ پُل میں بہت سے چور دریچے
ہیں۔ جوہیں دریچہ پر کسی کا قدم آیا، دھم سے سیل کے اندر جا گرا
اور گرتے ہی غائب۔ یہ مخفی چور دریچے پُل کے پھاٹک پر پاس پاس
اور بکثرت اسی غرض سے جڑے ہوئے ہیں کہ انسان کے گروہ کے گروہ
ابرِ سیاہ سے گذرتے ہی معًا اُن کی راہ سے نیچے گر پڑیں۔ اور فنا ہو جائیں۔
پُل کے درمیانی حصّے میں یہ چور دریچے چھدرے واقع ہوئے ہیں۔
پھر پُل کے آخری حصّے میں جہاں سالم محرابیں ختم ہوئیں۔ یہ دریچے
گنجان ہوتے چلے گئے ہیں۔

اِس میں شک نہیں کہ بعض آدمی جو تعداد میں بہت ہی کم تھے

اُفتاں و خیزاں ٹوٹی ہوئی محرابوں پر دھکا پیل کرتے ہوئے لپکے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن بُعدِ مسافت کی خستگی اور تکان سے چُور ہو کر یکے بعد دیگرے وہ بھی گرتے جاتے ہیں۔ اُن مختلف نتائج اور مسائل کے تصوّر میں جو اس حیرت انگیز عمارت کے مُشاہدے سے پیدا ہوئے تھے مَیں تھوڑی دیر تک بحرِ فکر میں غوطہ لگاتا رہا۔ بعض بعض آدمیوں کو مَیں نے دیکھا کہ عین لطف و جوانی اور عیش و کامرانی کے زمانہ میں ناگہاں غرقِ سیل فنا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بے چارے بے تحاشا ہر طرف دوڑتے ہیں کہ کسی چیز کو پکڑ کر اپنی جان بچا لیں۔ لیکن تنکے تک کا سہارا نہیں پاتے۔ یہ درد انگیز نظّارہ دیکھکر تو میرا دل اندر سے بھر آیا۔ بعض ایسے بھی دیکھے کہ کسی فکر میں آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ اور اسی عالمِ استغراق میں یکایک ٹھوکر کھائی اور نظر سے اُوجھل۔ بکثرت ایسے آدمی بھی نظر سے گذرے کہ پانی کے بُلبلوں کی حسرت اور تمنّا میں سراسیمہ ہیں۔ دُور سے تو یہ بُلبلے اپنی چمک دمک دکھاتے اور اُن کے سامنے رقص کرتے نظر آتے ہیں لیکن جُوں ہیں قریب پہونچ کر اُنھوں نے سمجھا کہ اب ہمارا چنگل اُن تک پہونچا اور اب یہ بُلبلے ہاتھ آئے ناگاہ اُن کا پاؤں ڈگمگایا۔ پھسلے، گرے اور لقمۂ نہنگِ اجل ہو گئے۔

اسی پریشان منظر میں بہت سے لوگ ایسے بھی دیکھے کہ ہاتھوں میں شمشیر برہنہ لیے ہوئے ہیں۔ کبھی پل کے اُس سرے تک دوڑتے چلے جاتے ہیں اور کبھی اُدھر سے اِدھر لپکے چلے آتے ہیں اور راہ میں اکثر آدمیوں کو زبردستی چور دریچوں میں ڈھکیل دیتے ہیں اُن غریبوں کا رستہ تو چور دریچوں سے بچا ہوا تھا۔ یہ ظالم جبرًا ڈھکیل نہ دیتے تو اُن کی جان کیوں جاتی۔

مجھے اِس غمناک نظّارے کے تصوّر میں محو دیکھ کر بالآخر جن بولا۔ "بس مرزا! بس! رہنے دو بہت دیکھ چکے پل پر سے نظر ہٹا لو۔ اور اب مجھے یہ بتاؤ۔ تمھیں کوئی ایسی چیز تو نظر نہیں آتی جو تمھارے فہم و اِدراک سے باہر ہو؟" میں نے پل کے اوپر کی طرف دیکھ کر دریافت کیا کہ "یہ بہت سے پرند جو پل پر منڈلا رہے ہیں۔ اور کبھی کبھی اُس پر آ بھی بیٹھتے ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟ جانور، جو سامنے اُڑ رہے ہیں اُن میں مجھے چیل، کوّے، عقاب، اور کئی قسم کے اور جانور نظر آتے ہیں۔ اور اُن میں لڑکے بھی ہیں۔ جن کے جانوروں ہی کے سے پر و بازو لگے ہوئے ہیں اور یہ بیچ کی محرابوں پر بکثرت اِس طرح بیٹھے نظر آتے ہیں جیسے بعض جانور اپنے اڈّے پر بیٹھتے ہیں۔" جن نے بتایا کہ "یہ حسد، حرص اوہام پرستی، مایوسی، عشق، اور اِسی قبیل کے اور بھی تفکّرات اور جذبات ہیں

جو پنجے جھاڑکر انسان کی زندگی کے پیچھے پڑے ہیں - اور موت سے پہلے اُس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاتے رہتے ہیں" اب تو میں نے اک آہ سرد بھری اور دل میں سوچنے لگا - بارِ الہا ! انسان کو پیدا ہی کیوں کیا ! ایسے ایسے مصائب میں گرفتار اور آخرکار شہبازِ اجل کا شکار ہے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے		ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے

میری یہ حالت دیکھ کر جن کو رحم آیا - اور کہنے لگا " مرزا بس اب اِس بے لطف نظّارے سے اپنی نظر ہٹا لو اور انسان کی اِس ہستی کا تصوّر کرو ، یہ گویا ابد کے راستہ کی پہلی منزل ہے - اب تم اُس گہرے کُہر پر نظر ڈالو ، جہاں سَیل میں انسانِ فانی کی بہت سی نسلیں ڈوبی پڑی ہیں" میں نے جن کے ارشاد کے موافق اپنی نظر کو اُس طرف دوڑایا یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ جن نے اپنی کرامت سے میری بصارت کو تقویت پہونچائی یا کُہر کے اُس گہرے حصّہ کو دُور کر دیا جو نظر کے لئے ناقابلِ نفوذ تھا - البتہ مجھے صاف نظر آنے لگا - کہ کُہر کے دوسرے سرے پر وادی ایک بحرِ زخّار میں کشادہ و وسیع ہوتی چلی گئی ہے جس میں ہیرے کا ایک عظیم الشّان پہاڑ ہے جو اُس کو دو برابر حصّوں میں تقسیم کرتا چلا گیا ہے -

سمندر کے نصف حصّہ میں ابتک دُھواں دھار ابر سیاہ چھا رہا ہے جس میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ دوسرے نصف حصّہ میں مطلع صاف اور سمندر شفّاف نظر آتا ہے جس میں بے شمار جزیرے گلہائے رنگا رنگ اور شجرہائے باردار سے پٹے پڑے ہیں۔ جن کے تلے صاف شفاف پانی کی نہریں پڑی بہ رہی ہیں۔ آدمی وہاں کے امیرانہ زرّیں لباس زیب تن کیے ہاتھوں میں یاقوت کے کنگن پہنے؛ سروں پر دستار و کلاہ سجے پھولوں کے سہرے لٹکائے، جابجا دُولھا بنے پھرتے ہیں۔ کوئی چمن میں گلگشت کرتا ہے تو کوئی نہر کے کنارے فرش مخملیں پر بے خبر پڑا سوتا اور کوئی پھولوں کی سیج پر سُرخاب کے پروں کا تکیہ لگائے آرام کرتا ہے۔ مُرغانِ نغمہ سنج کے چہچہے، پانی کا جھرنا مُطربانِ خوش الحان کا گانا اور مختلف ساز اور باجوں کی سُریلی صدائیں مجھ کو بھی سُنائی دیتی تھیں۔ اِس فضائے دِلکشا اور منظر راحت افزا کے نظّارے سے میرا دل باغ باغ ہوا جاتا اور پھولا نہیں سماتا تھا۔ یہ سماں دیکھ کر میرے دِل میں آرزو پیدا ہوئی کاش میرے پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر وہیں جا پہونچوں۔ جن نے کہا "وہاں جانے کا کوئی رستہ نہیں، مگر صرف ایک راہ کہ موت کے دروازوں سے ہوکر جانا ہوتا ہے۔ جس کو تم نے پُل پر کُھلتے دیکھا تھا۔"

یہ سرسبز و شاداب جزیرے، جو تمھاری حدِ نظر سے پرے تک سطحِ آب پر پھیلے پڑے ہیں، تعداد میں سمندر کے ریت کے ذرّوں سے بھی کہیں زیادہ ہیں اور ان جزائر کے پرلے پار اور جزیرے ہیں جو تمھاری انتہائے نظر سے بھی آگے تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ حتّٰی کہ تمھاری وسعتِ خیال بھی اُس کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ وہی نیک بندوں کے مسکن ہیں جو اُن کو نیکیوں کی جزا میں عطا کیے جاتے ہیں اور یہ جزائر کی گوناگون نعمتیں اُن کو اُن کی نیکیوں کے درجے کے مطابق ملتی ہیں۔ جو نیک بندے اُن جزائر میں آباد ہیں۔ اُنھیں کے درجہ اور رتبہ اور نیکی کے مطابق یہ جزیرے بنائے گئے ہیں۔ ہر جزیرہ ایک بہشت ہے جس میں اُس کے باشندوں کے خلقت کی مناسبت سے سامانِ عیش و نشاط فراہم کیا گیا ہے۔

مرزا! کیا یہ مقامات ایسے ہیں جن کے حاصل کرنے کی کوشش نہ کی جائے؟ کیا تم موت کو مصیبت سمجھتے ہو۔ جس میں ایسے انعامات حاصل کرنے کا موقع دیا گیا ہے؟ کیا موت سے خوف کرنا چاہیے جو ایسی لازوال خوشی کی طرف تمھاری راہ نمائی کرتی ہے"

میں نے ایسی حسرت بھری ہوئی نگاہوں سے اُن راحت فزا جزیروں کی طرف دیکھا جو بیان سے باہر ہے۔ میں نے جن سے

مِنّت و سماجت کے ساتھ درخواست کی کہ مجھے اِن راز ہائے سر بستہ سے آگاہ فرمائیے۔ جو ہیرے کے پہاڑ کے اُس طرف غلیظ ابر سیاہ کی تاریکی میں پوشیدہ ہیں۔ جن نے جب کچھ جواب نہ دیا تو میں اُس کی طرف مڑا۔ تاکہ دوسری دفعہ سوال کروں، دیکھتا ہوں تو جن غائب پھر میں اِس خواب کی طرف جسے اِتنی دیر سے دیکھ رہا تھا متوجہ ہوا مگر اب جو دیکھتا ہوں تو نہ وہ محراب دار پُل، نہ وہ سَیلِ متواج نہ وہ بہشتی جزیرے، وہی کھنارِ بغداد ہے اور کچھ بَیل بھیڑیں اور اونٹ کھڑے چر رہے ہیں ؎ ع

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا"

حصّۂ نظم

مثنویات

از میر حسن دہلوی

ایک شاہی خانہ باغ

دیا شہ نے ترتیب اِک خانہ باغ
ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ

عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان
لگے جس میں زربفت کے سائبان

چھتیں اور پردے بندھے زرنگار
دَروں پر کھڑی دست بستہ بہار

وہ مقیش کی ڈوریاں سربسر
کہ مہ کا بندھے جس میں تارِ نظر

بقوں کا تماشہ تھا آنکھوں کا جال
نگہ کو وہاں سے گزرنا محال

سنہری مُغرّق چھتیں ساریاں[1]
وہ دیوار اور دَر کی گُلکاریاں

[1] موصوف بصیغۂ جمع ہو تو اُس کی صفت کو بصیغۂ جمع بولنا پُرانا محاورہ ہے جو اَب متروک ہوگیا ۱۲

دیے ہر طرف آئنے جو لگا — گیا چوگنا لطف اُس میں سما

وہ مخمل کا فرش اُس کا ستھرا کہ بس — بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس

رہیں لخلخے اُس میں روشن مُدام — معطّر شب و روز جس سے مشام

زمیں کا کروں واں کی میں کیا بیاں — کہ صندل کا اِک پارچہ تھا عیاں

بنی سنگِ مرمر سے چوپڑ کی نہر — گئی چار سُو اُس کے پانی کی لہر

قرینے سے گرد اُس کے سروِ سہی — کچھ اک دُور دُور اُس سے سیب بھی

ہوائے بہاری سے گُل کھِل رہے — چمن سارے شاداب اور ڈہڈہے

زمرّد کے مانند سبزہ کا رنگ — روش پر جواہر لگا جیسے سنگ

روش کی صفائی پہ بے اختیار — گُلِ اشرفی نے کیا زر نثار

چمن سے بھرا باغ، گُل سے چمن — کہیں نرگس و گل، کہیں یاسمن

چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا — کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا

کھڑے شاخِ شبّو کے ہر جا نشان — مدن بان کی اور ہی آن بان

کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار — جُدی اپنے موسم میں سب کی بہار

کہیں جعفری اور گیندا کہیں — سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں

عجب چاندنی میں گلوں کی بہار — ہر اک گُل سفیدی سے مہتاب وار

کھڑے سرو کی طرح چنپے کے جھاڑ — کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ

کہیں زرد نسریں، کہیں نسترن — عجب رنگ پر زعفرانی چمن

پڑی آبجو ہر طرف کو بہے — کریں قمریاں سرو پر چہچہے
گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا — اُسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر — نشے کا سا عالم گلستان پر
لیے ہاتھ میں بیلچے مالنے — چمن کو لگیں دیکھنے بھالنے
کہیں تخم پاشی کریں گود کر — پنیری جما دیں کہیں کھود کر
خراماں صبا صحن میں چار سُو — دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بُو
کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے — لیے ساتھ مرغابیوں کے پرے
صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور — درختوں پہ بگلے، منڈیروں پہ مور
چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا — ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے پھول — پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول
درختوں نے برگوں کے کھولے ورق — کہ لیں طوطیاں بوستاں کا سبق
سماں قمریاں دیکھ اُس آن کا — پڑھیں بابِ پنجم گلستان کا

از مرزا رفیع سودا

اپنی لاٹھی کی تعریف

ہوتی ہے دُنیا میں جو کچھ تحفہ چیز
سب سے ہے سودا کو یہ لاٹھی عزیز

کوچ و مقام اس کا ہے سب اپنے ہاتھ
جب کہیں چلیے تو ہے بے عُذر ساتھ

ہاتھ میں رکھتے ہیں اسے ہوشمند
ڈرتے ہیں سب اس سے درند و گزند (پرند)

کھینچ نہ سکیے جہاں شمشیر و تیغ
اس کو لگا بیٹھیے واں بے دریغ

اتنا کم آزار اور ایسا شفیق
اور بھی کوئی ہے کسی کا رفیق

کس میں یہ توفیق ہے کیجو[1] خیال
ہاتھ پکڑ گرتے کو لیوے[2] سنبھال

چوب نہیں دلبر خوش خو ہے یہ
یار ہے یہ، قوتِ بازو ہے یہ

اس کے گھرانے کو جو کیجے خیال
چھوٹے بڑے جتنے ہیں سب ذی کمال

کوئی تو ہے خامۂ معجز طراز
کوئی ستم گر ہے نئے نغمہ ساز

تیر نمط ہے کوئی صاحب ہنر
کوئی ہے نیچا، کوئی ہے نیشکر

خرد جو ہوں ہمسرِ تیر و قلم
نامِ بزرگاں بہ بزرگی علم

اُس کے بڑوں کی ہے بڑائی قدیم
دال ہیں اعجازِ عصائے کلیم

[1] اب کیجو کے بجائے کرنا فصیح سمجھا جاتا ہے ۱۲

[2] اب تو لینا کا مضارع "لے" اور دینا کا مضارع "دے" بولتے ہیں۔ لیوے دیوے غیر فصیح سمجھا جاتا ہے ۱۲

ملنے سے انساں کے ہیں دو ہی اثر
یا تو ہو کچھ فائدہ یا ہو ضرر

اِس کے فوائد میں تو نقصاں نہیں
اور مضرت کا سوا امکاں نہیں

اہلِ نظر کی یہ ہدایت پناہ
جادۂ تاریک میں ہے شمع راہ

بیہدہ کج بحثی سے وارُستہ ہے
راستی اپنی پہ کمر بستہ ہے

گو کہ سخن گو نہیں راست باز
تِس[1] پہ یہ سمجھاوئے[2] نشیب و فراز

جو کوئی رکھتا ہے ٹک[3] اک گوش ہوش
اس کو وہ ہرگز نہ کہے گا خموش

قدر خموشاں وہی سمجھا ہے یار
تیغِ زباں سے جو ہوا دل فگار

ہم سے زباں دانوں سے بہتر ہے یہ
بے سخن اللہ سخن ور ہے یہ

پاسِ حقیقت اِسے ملحوظ ہے
ہرزہ سخن کہنے سے محفوظ ہے

جو کوئی سمجھے ہے، رموز و نکات
اُس سے سدا کہتی ہے لاٹھی یہ بات

گو کہ ہوں اب نالہ گرہ در گلو،
"مَیں بھی تھی سرسبز جہاں میں کبھو[4]"

"تازہ و تر جگ میں رہی سال و ماہ
زاغ و زغن کی ہوئی آرام گاہ"

"جب تئیں دُنیا سے تھی اُمید و بیم
سمجھی تھی کچھ فرق سموم و نسیم"

"جوں ہی زمانے نے کیا بار ور
دُوں ہی دکھایا دمِ تیغ و تبر"

"بانس کا پھلنا ہے جہاں کی مُراد
شادی سے یاں کی کوئی کیونکر ہو شاد"

---

[1] تِس پر اب متروک ہے اس کے بجائے "لیکن" یا "اُس پر بھی" یا "باوجود اِس کے" بولتے ہیں ۱۲

[2] سمجھاوے غیر فصیح "سمجھاتا ہے" مستعمل فصیح ۱۲ [3] ٹک یعنی ذرا متروک ۱۲ [4] کبھو کے بجائے کبھی مستعمل ہے ۱۲

۱۳۳۹۱

زیادہ[1] غرض کچھ نہیں کہنا روا — بس ہے یہی آہ! مری یہ صدا"

سحر ہے یا لکڑی کی تقریر ہے — جس میں کہ عبرت کی یہ تاثیر ہے

دل ہے مرا برق نمط بے قرار — دیدے ہیں جوں ابر سدا اشکبار

غم کی سیاہی کی گھٹا رات ہے — آج بھی یاں موسم برسات ہے

چپ رہ سودا نہ ہو بر خود غلط — بس ہے ترے حق میں یہ نکتہ فقط

لکڑی کی نسبت سے تو معذور ہے — آدمی ہونا تو بہت دُور ہے

از مؤلف

مکالمۂ سیف و قلم

سیف و قلم میں جو ہوئی دو بدو — شوق ہے تم کو تو سنو مو بمو

خامہ لگا کہنے کہ "او تیغ تیز! — تجھ سے بھلا کس کو مجالِ ستیز

آب وہ تیری، کہ نہ ٹھہرے نگاہ — آنچ وہ تیری، کہ خدا کی پناہ

رہزنِ سفّاک کی یاور ہے تو — خون کے دریا کی شناور ہے تو

سیکھے ستم کس ستم ایجاد سے — شور ہے برپا تری بیداد سے

شوخی دریا کی و تیزی میں برق — آگ ہے اور آب میں رہتی ہے غرق

[1] یہاں زیادہ کی (ی) ساقط ہوتی ہے، سودا کے زمانہ میں اسی طرح بولتے تھے مگر اب زیادہ کی (ی) کا سقوط جائز نہیں ہے ۱۲

تُند مزاجی میں تو شدّاد ہے
آتشِ سوزاں کا پیا تو نے دُود
حیف تری سختی و آہن دلی
خرمنِ ہستی میں لگاتی ہے آگ
گو کہ مُجلّا ہے تو آئینہ وار
فتنۂ عالم ہے ترا بانکپن
شکل انوکھی، تو نرالی ہے دَھج
قحط زدوں کا سا تن و توش ہے
عرصۂ راحت ہے ترے دم سے تنگ
تری جبلّت ہے فسوق و جدال
قتل کا رکھتی ہے بہت چاؤ تو
اُف نہ کرے لاکھ گلے کاٹ کر
خلقِ خدا تجھ سے ہے آزار کش
بحرِ فنا کیے ترے گھاٹ کو
گرچہ سراپا ہے ترا آب گوں
تو نے اُجاڑیں بہت آبادیاں
تو نے کروڑوں کیے بچّے یتیم

بیضۂ فولاد کی اولاد ہے
اس لئے جاں سوز ہے تیرا وجود
نوعِ بشر کی ہے تو دشمن دلی
عافیت و امن سے رکھتی ہے لاگ
تیرہ درونی ہے تری آشکار
شوخی و شنگی ہے ترا خاص فن
جسم بھی خمدار طبیعت بھی کج
کھانے پہ ڈھو کے تو بلانوش ہے
ایسی لڑاکا کہ بنی خانہ جنگ
ناحق و حق کا نہیں تجھ کو خیال
رن میں کیا کرتی ہے ستھراو تو
جی نہ بھرے تیرا لہُو چاٹ کر
کرتی ہی رہتی ہے سدا چپقلش
جس نے دیے سیکڑوں بیڑے ڈبو
پر تری چتون سے ٹپکتا ہے خوں
چھین لیں اقوام کی آزادیاں
لاکھوں ہی باپوں کے کیے دل دو نیم

لے گئی ماؤں کی کمائی کو لوٹ — رہ گئیں بے چاریاں چھاتی کو کوٹ

دُلہنیں روتی ہیں تری جان کو — ساتھ ہی لے جائیں گی ارمان کو

موتیوں سے مانگ تھی جن کی بھری — اُن سے کراتی ہے تو گدیہ گری

تو نے رفیقوں کو رُلایا ہے خوں — غم سے عزیزوں کو ہوا ہے جنوں

تفرقہ پردازیا! یہ کیا کر دیا — گوشت کو ناخن سے جُدا کر دیا

شیوہ ترا شہرۂ آفاق ہے — خون خرابے میں تو مشّاق ہے

چاہتی ہے بُغض و عداوت کو تو — اُنس و محبت کی نہیں تجھ میں بُو

تیری دغا بازی ہے ضرب المثل — غیر ہے قبضہ سے گئی جب نکل

تو نے وفا کی نہیں پٹّی پڑھی — اُس کی ہوئی جس کے تو ہتّے چڑھی

کون کرے تجھ سے رفاقت کی آس — کچھ نہیں تجھ کو حقِ صحبت کا پاس

رکھتی نہیں سابقۂ لطف یاد — کور نمک ہے ترا کیا اعتماد

میل حریفوں سے یگانوں سے چھوٹ — نکلے گا مالک کا نمک پھوٹ پھوٹ

مملکتیں خاک رسیہ تو نے کیں — تیری قساوت نے اُجاڑی زمیں

بستیاں کرتی ہیں پڑی بھائیں بھائیں — مقبرے آباد ہیں کچھ دائیں بائیں

اُٹھّے تری ذات سے جو جو فساد — اہلِ تواریخ کو اب تک ہیں یاد

ثبتِ جریدہ اُنھیں ہی نے کیا — ہے وہ خلاصہ تری روداد کا

تو ہی بھرت کھنڈ کی بھارت میں تھی — تیری خوشی جانوں کی غارت میں تھی

ہند کے جو دھا تھے بڑے سُور بیر — کھا گئی تو سب کو دم دار و گیر

تو نے نصیحت نہ کسی کی سُنی — چٹ کیے اُس عہد کے گیانی گُنی

وادیٔ توران میں چمکی کبھی — دیتی تھی ایران کو دھمکی کبھی

بارطہ پہ تیری جو چڑھا پہلوان — نام کو بھی اُس کا نہ چھوڑا نشان

معرکۂ رُستم و افراسیاب — تیری بدولت ہُوا زیبِ کتاب

تو جو طرف دارِ سکندر ہوئی — خاک میں دارا کو ملا کر ہوئی

ڈھایا ہے کیا تو نے غضب بر بلا — گرم کیا معرکۂ کربلا

طُرفہ ستمگار ہے عالم میں تو — عید مناتی ہے محرم میں تو

تو نے ہڑپ کر لیے لاکھوں ہی سر — کم نہ ہوئی پر تری جوع البقر

رائے پتھورا کا وہ جاہ و جلال — ہو گیا پر مارتے خواب و خیال

انجمنِ عیش بنی غمکدہ — دہلی و اجمیر تھے ماتم کدہ

سوگ میں رانی نے کیا سینہ چاک — آتش سوزاں میں ہوئی جل کے خاک

رائے رہا اور نہ رانی رہی — زیبِ سخن تیری کہانی رہی

چونک پڑا فتنۂ جنگِ تتار — لشکرِ چنگیز کا اُٹھا غبار

چھا گیا اِک ابرِ ستم چار سو — خون کے سیلاب بہے کُو بہ کُو

صرصرِ تاراج چلی سر بہ سر — آگ وہ بھڑکی کہ جلے خشک و تر

تیرے ہی کوتک تھے یہ اے نابکار — کیا کہوں بس تجھ کو خدا کی سنوار

نکلا تھے لے کے جو تیمور لنگ
پھونک دیا چار طرف صورِ جنگ

چوس لیا روس کا خونِ جگر
داب دیے قاف میں دیووں کے سر

خون سے گل خاکِ صفاہاں ہوئی
کانپ اٹھی تختگہِ ہند بھی

ناحیۂ شام سے تا حدِ چیں
مقتلِ انسان بنا دی زمیں

تو جو بنی ہمدمِ نیپولین
بول دی یورپ میں صدائے بزن

تاجورِ اطراف کے تھرا گئے
ناک میں ہمسایوں کے دم آ گئے

جب ہوئی نادر کی تو زیبِ کمر
خلقِ خدا بول اٹھی اَلحَذَر

حالتِ دہلی ہوئی زار و زبوں
کوچہ و برزن میں بہی جوئے خوں

کیجئے القصہ کہاں تک بیاں
فردِ مظالم ہے تری داستاں

میری غرض تیری فضیحت نہیں
بلکہ بجز پند و نصیحت نہیں

تند تھی از بس کہ صریرِ قلم
سن کے ہوئی تیغِ دودم بھی علم

آتشِ غیظ اس کی بھڑکنے لگی
بن گئی برق اور کڑکنے لگی

ڈانٹ کے بولی کہ "خبردار ہو
اب مری باری ہے اے ہشیار ہو

بد ہوں خدا جانے کہ ہوں نیک میں
رکھتی ہوں دل اور زباں ایک میں

مجھ کو دورنگی نہیں بھاتی ذرا
میل ملاتی نہیں کھوٹا کھرا

پھیر ہو، پھیر، جو کہیں ہو تو کہیں
ایک جھتی ہے مرا آئین و دیں

بات کی مجھ کو نہیں زنہار پیچ
میرا اکھیرا، دھرا کس بل سے ہیچ

حجّتِ قاطع ہوں میں سرتا بہ پا — چھوڑتی باقی نہیں تسمہ لگا

جب کہ نہ ہو فصلِ خصومت بہم — میرے سوا کون بنے واں حَکَم

عیب کہو میرا اُسے یا ہُنر — فیصلہ دو ٹوک، اِدھر، یا اُدھر

جنگ کا بوتی ہوں اگر بیج میں — سینچ کے پھر اُس کو بتدریج میں

پَود بڑھاتی ہوں وہ نعم البدل — رفق و مُدار کے لگیں جس میں پھل

تیری طرح کاہے کو باتیں گڑھوں — لڑنے پہ آؤں تو میں سَن کھُڑ لڑوں

خوب کیا تو نے نکالی جو چھیڑ — دوں گی ابھی میں ترا بخیہ اُدھیڑ!

غزلیّات

از فصیح الملک نواب مرزا خاں۔ داغؔ۔ دہلوی

(۱)

ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا
بُرائی دیکھی، بھلائی دیکھی، عذاب دیکھا، ثواب دیکھا

نظر میں ہے تیری کبریائی، سما گئی تیری خود نمائی
اگرچہ دیکھی بہت خدائی مگر نہ تیرا جواب دیکھا

سُرورِ عیش و نشاط کیسے، بدل گئے رنگ ہی جہاں کے
سُنا نہ تھا کان سے جو ہم نے وہ آنکھ سے انقلاب دیکھا

شرابِ غفلت سے داغؔ غش تھے دکھائے غفلت نے کیا تماشے
کہ سوتے سوتے جو چونک اُٹھے، مگر کوئی تم نے خواب دیکھا

(۲)

اب دل ہے مقام بے کسی کا　　یوں گھر نہ تباہ ہو کسی کا
رونا ہے اب اُس ہنسی خوشی کا　　ماتم ہے بہارِ زندگی کا

اتنی ہی تو بس کسر[۱] ہے تم میں کہنا نہیں مانتے کسی کا
جو دم ہے وہ ہے عجبا غنیمت سارا سودا ہے جیتے جی کا
آغاز کو کون پوچھتا ہے انجام اچھا ہو آدمی کا
کہتے ہیں اسے زبانِ اردو جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا
ایسے سے جو داغ نے نباہی سچ ہے کہ یہ کام ہے اسی کا

از شمس العلما مولوی نذیر احمد ایل ایل ڈی (اڈنبرا)

نکل جائے ارمان گل کی ہوس کا جو ہو جائے قسمت سے وا در قفس کا
مگر موت سے ابن آدم ہے عاجز وگرنہ نہ تھا یہ کسی کے بھی بس کا
ہو انسان کیا ایسی ہستی پہ نازاں کہ مہماں ہے دنیا میں چندیں نفس کا
کس آہستگی سے رواں ہیں قوافل نہ بانگ حدی ہے نہ نالہ جرس کا
جو کچھ تم کو کرنا ہے کرلو عزیزو! کہ اب وقت باقی نہیں پیش و پس کا
بچائے رہو مے سے دامانِ تقویٰ نہ لگ جائے دھبہ کہیں اس نجس کا
ہنر ہو تو عزت کو پہونچو ہی پہونچو بھلا کیا نہ ہوگا کبھی عطر خس کا

از خواجہ آتش

مقبول ہے جو ذرہ کہ درگاہ کا تیری وہ ملتفتِ نیرِ اعظم نہیں ہوتا

۱؎ اگرچہ اصل میں کسر بہ سکون سین ہے مگر خاص و عام سب بتحریک بولتے ہیں اس لئے یہی فصیح ہے ۱۲

افسوس ہے انسان نہو گر علم کا جویا
وہ مال ہے یہ صرف سے جو کم نہیں ہوتا

اُس باغ کے ناظر نگہ پاک سے ہیں ہم
گل چیں ہیں کہ آلودۂ شبنم نہیں ہوتا

ثابت قدم فقر کو ہے نفس کشی شرط
بے دیو کے مارے ہوئے رستم نہیں ہوتا

یہ نکتہ ہمارا ہے سخن چیں کو نصیحت
الزام جو دیتا نہیں ملزم نہیں ہوتا

تا چند بہار آتی نہیں دیکھیے انیسؔ
کب تک شرفِ نیّرِ اعظم نہیں ہوتا

از میر محمد تقی میرؔ

جہاں کا دریاے بیکراں تو سراب پایاں کار نکلا
جو لوگ تہ سے کچھ آشنا تھے انھوں نے لب تر کیا نہ اپنا
جہاں میں رہنے کو جی بہت تھا نہ کر سکے میرؔ کچھ توقف
بنا تھی ناپائدار اُس کی، اسی سے رہنا بنا نہ اپنا

از خان بہادر سیّد اکبر حسین اکبرؔ

بنو گے خسروِ اقلیمِ دل، شیریں زباں ہو کر
جہاں گیری کرے گی یہ ادا نورِ جہاں ہو کر
مجال گفتگو کس کو فنا کا جب پیام آیا

ہوئی خاموش آخر شمع بھی آتش زباں ہوکر
جوانی کی دعا لڑکوں کو ناحق لوگ دیتے ہیں
یہی لڑکے مٹاتے ہیں جوانی کو جواں ہوکر
پھنسایا جھوٹی باتوں سے مجھے دُنیا نے غفلت میں
سُلایا مجھ کو اس مکّار نے افسانہ خواں ہوکر
زمیں کی طرح جس نے عاجزی و خاکساری کی
خدا کی رحمتوں نے اُس کو ڈھانکا آسماں ہوکر
جوانانِ چمن نے اپنا اپنا رنگ دِکھلایا
کسی نے یاسمن ہوکر کسی نے ارغواں ہوکر
کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحنِ گلستاں میں
صدائے نغمۂ بُلبل اُٹھی بانگِ اذاں ہوکر
ہوائے شوق میں شاخیں جُھکیں خالق کے سجدہ کو
ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتّی زباں ہوکر
زبانِ برگِ گُل نے کی دُعا رنگیں عبارت میں
خدا سرسبز رکھّے اس چمن کو مہرباں ہوکر
نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتّوں میں نہاں ہوکر

از شمس العلما مولانا حالی

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیّاح!
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپّے چپّے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں اک ایسا گھرانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر! گھر تھا تمھارا دہلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہوگی یارو!
یاد کرکرکے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کردیا مرکے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھوگے کبھی لطف شبانا ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

از مؤلّف

بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں
ہے یہ تیری ہی صدا غیر کی آواز نہیں

لکھ سکے کون، وہ کیا ہے مگر از روے یقین
گل نہیں، شمع نہیں، سروِ سرافراز نہیں
دل ہوے لوٹ، تو کیوں وجہ تسلّی ہو دروغ
طائرِ مُژدہ مگر لُقمۂ شہباز نہیں
دستِ قدرت نے مجھے آپ بنایا ہے تو پھر
کون سا کام ہے میرا کہ خدا ساز نہیں

از حکیم مومن خاں مومن

نالہ ہی سکتے ہے گو ہم مُدّعا کہنے کو ہیں
لب نہیں کھلتے ہیں اب کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
دوست کرتے ہیں ملامت، غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب بُرا کہنے کو ہیں
شکوہ حرفِ تلخ کا، یا شورِ بختی کا گلہ
ہم جو کچھ کہنے کو ہیں، سو بے مزا کہنے کو ہیں
ہیں گلہ کرتا ہوں اپنا، تو نہ سُن غیروں کی بات
ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں

لے سکتے متروک ہو گیا اب نکلتا ہے مستعمل ہے ۱۲

از مرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱)

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

(۲)

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں[۱] شاید
مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

۱؎ اب کہویں کے بجائے کہیں مستعمل ہے ۱۲

از شیخ ابراہیم ذوق

گذرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں — کہ جیسے جائے کوئی کشتیِ دخانی میں

رکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں — کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

کہانیاں ہیں حکایاتِ خضر و آبِ بقا — بقا کا ذکر ہے کیا اس جہانِ فانی میں

نہیں خضاب کے مطلب ہیں یہ موئے سفید — سیاہ پوش ہوئے ماتمِ جوانی میں

ہمیشہ ہے مجھے سرمایۂ بقا میں فنا — حباب وار ہوں میں آبِ زندگانی میں

بجز نثار علی شاہ کون جانے ذوق — تری زبان کا مزا تیری شعر خوانی میں

از سید انشاء اللہ خاں انشا

حق تعالیٰ کی طرف سے جسے امداد نہ ہو — تو وہ گھر تا بہ قیامت کبھی آباد نہ ہو

اب کے قدغن یہ ہوا ہے کہ خبردار کہیں — شورشِ زمزمۂ مرغِ چمن زاد نہ ہو

ہے یہ انصاف بھلا خوش رہے بس تو ہی فقط — چھٹ[1] ترے اک متنفس کبھی دل شاد نہ ہو

خانہ آباد! جو اجڑے ہوئے ہوں اُن کو بسا — نہ کہ یہ قصد کہ کوئی کہیں آباد نہ ہو

مٹ گیا جب کہ حباب آہ! تب آئی یہ صدا — زندگانی ہی نہیں جس کی یہ بنیاد نہ ہو

اتنا نہ کر اے مرغِ نوا سنج! خموش — یاں کوئی دم لگائے کہیں صیاد نہ ہو

[1] چھٹ بمعنے سوا اب متروک ہے ۱۲

ہو جو انشا کو اجازت تو بھرے وہ نالہ | کبھی بلبل کے فرشتوں کو بھی جو یاد نہ ہو

نقاش

بڑھا ہے آگے کو روزِ روشن ہٹی ہے پیچھے کو رات کالی
بکھر گیا آسماں کا میلہ ہوئی ستاروں سے بزم خالی
ہنسا کے بجلی کو ابر رویا جگا کے سورج کو چاند سویا
یہ نقشِ ہستی ہے اعتباری، کہیں جلالی، کہیں جمالی
کسی کی چلتی نہیں یہاں کچھ پکارتے سب ہیں ما عرفنا
وہ فخر رازی ہوں، یا فلاطوں، جلالِ رومی ہوں، یا غزالی
کیا ہے ایجادِ دماغ و دل نے نئے نئے گل لگے ہیں کھلنے
کسی نے برقع اُتار پھینکا کسی نے چلمن ہے توڑ ڈالی
عطا کیا طبعِ نکتہ رس نے مرے قلم کو سخنوری میں
خیال انوکھا، بیان اچھوتا، زمین نئی اور روش نرالی

از امیر الشعرا امیر مینائی

(۱)

سوچ لے یہ عہد وقت انکار کے | دونوں لب ہیں دو گواہ اقرار کے
گنتہ باری میں مُقر ہو عجز کا | جیت لے بازی کو ہمت ہار کے

شیخ کعبے میں، برہمن دیر میں — سب ہیں مجرائی ترے دربار کے

حادثوں سے بے خطر ہیں خاکسار — کب دبا سایہ تلے دیوار کے

ذِلّت و خواری و رسوائی امیرؔ — سب ہیں دھبّے دامنِ پندار کے

(۲)

ناز نیرنگ پر اے ابلقِ ایّام نہ کر

نہ رہے گی یہ سفیدی، یہ سیاہی تیری

دل تڑپتا ہے تو کہتی ہیں یہ آنکھیں رُو کر

اب تو دیکھی نہیں جاتی ہے تباہی تیری

ہم فقیر اپنی فقیری میں شب و روز ہیں مست

تجھ کو اے شاہ! مبارک رہے شاہی تیری

کیا ہوا تجھ کو کہ غافل ہے اوامر سے امیرؔ

حرص سے طبع ہے مُشتاق نواہی تیری

از مؤلف

ہنس کے جھیلے ہجوم آلام کے — شعبدے ہیں گردشِ ایّام کے

ہمّتِ مردانہ! تجھ کو آفریں — کرکے چھوڑا سر ہوئی جس کام کے

صبح کے بھولے تو آئے شام گھر — دیکھیے کب آئیں بھولے شام کے

مِٹ گئی ہے دل سے آزادی کی یاد　　کتنے خوگر ہو گئے ہم دام کے

از خواجہ حیدر علی آتش

گشتہ ہم بھی تری نیرنگی کے ہیں یاد رہے
او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے!
گوش زد ہو تو کہیں کوسِ سفر کی آواز
چل کھڑے ہوں گے کمر باندھ کے چلنے والے
باغِ عالم میں یہی اپنی دُعا ہے ہر صُبح
"رہیں سرسبز شجر پھُولنے پھلنے والے"
اُن سے کہہ دو نہیں آہستہ جو رکھتے دو گام
گر بھی پڑتے ہیں کبھی دوڑ کے چلنے والے
بس قلم صفحۂ ہستی سے اُٹھا، اے آتش
ڈھل چکے شعر جو تھے فکر سے ڈھلنے والے

از میر نظام الدّین ممنون دہلوی

بُلبُل ہی اس چمن سے نہ کچھ نوحہ گر گئی
بادِ سحر بھی آ کے دمِ سرد بھر گئی

پڑھ دَرد کوئی شعر پڑھا آہِ سَرد کی
اس مشغلہ میں رات ہماری گذر گئی

اس سیلِ اشک کا نہ گھٹا زور، ورنہ یاں
سو بار جُوئے آب چڑھی اور اُتر گئی

ہر حرفِ آرزو پہ نہ اِتنا غضب میں آ
کرتے بھی ہیں کسی نہ کسی بات پر، گئی

کب کا غُبار تھا تجھے مجھ سے بھلا! صبا!
کیوں میری مُشتِ خاک کو برباد کر گئی

ممنونؔ! اپنی آہ مسیحا کے رُو برُو
گردوں پہ لے کے تحفۂ سختِ جگر گئی

از مرزا رفیع سوداؔ

اُس دل کی تفتِ آہ سے کب شعلہ بر آوے
بجلی کو دمِ سرد سے جس کے حذر آوے

سینوں کو دِلوں سے تو نہ خالی کر اب اتنا
ڈرتا ہوں نہ چھاتی کسی بے دِل کی بھر آوے

کیا ہو جو قفس تک مِرے آب صحنِ چمن سے

چھاتی بھرنا۔ غمگین ہونا۔ یہ محاورہ متروک ہوگیا۔ اب جی بھر آنا یا دل بھر آنا بولتے ہیں۔ چنانچہ۔ ع
دل ہوا رنج سے خالی کبھی تو جی بھر آیا ۱۲

دو برگ لیے گل کے نسیم سحر آوے
نامہ کا جواب آنا تو معلوم ہے اب کاش!
قاصد کے بد و نیک کی مجھ تک خبر آوے

از میر محمد تقی میر

نہ گلشن میں چمن پیرا نے بلبل تجھ کو جا دی ہے
سپاس ایزدی کر، جس نے کہ یہ ڈالی نوا[1] دی ہے
نہیں ٹک بیٹھنے دیتے تم اپنی بزم میں ہم کو
مروّت رسم تھی مدّت کی، سو تم نے اٹھا دی ہے
رہائی چنگلِ بازِ فلک سے مجھ کو مشکل تھی
مری یہ بند، چڑیا کی سی مولا نے چھڑا دی ہے
درِ گلزارِ ہستی از صبح وا، اے باغباں! مت کر
اڑا لیتی ہے مٹی بھی صبا اک چور بادی ہے
کجیِ ذہن اس وادی میں گمراہی کی ہے باعث
سلیم الطبع کو تو پاؤں کا ہر نقش ہادی ہے
ہوئی ہے دل کی محویّت سے یکساں یاں غم و فرحت
نہ ماتم مرنے کا ہے میر! نے جینے کی شادی ہے

[1] نوانا متروک ہوگیا اب بجائے اس کے "جھکانا" بولتے ہیں۔

قصائد

از مسٹر ظفر علی خاں بی۔ اے (علیگ)

بنائے اپنی حکمت سے زمین و آسماں تو نے
دکھائے اپنی قدرت کے ہمیں کیا کیا نشاں تو نے

تری صنعت کے سانچے میں ڈھلا ہے پیکر ہستی
سمویا اپنے ہاتھوں سے مزاج جسم و جاں تو نے

نہیں موقوف خلّاقی تری اس ایک دنیا پر
کیے ہیں ایسے ایسے سیکڑوں پیدا جہاں تو نے

ترے ادراک میں ہے عقل حیراں اور سرگرداں
ہمیں حکمیں ڈالا بخش کر وہم و گماں تو نے

دلوں کو معرفت کے نور سے تو نے کیا روشن
دکھایا بے نشاں ہو کر ہمیں اپنا نشاں تو نے

نہ ہوتی گر خودی ہم میں تو جو تو تھا وہی ہم تھے
یہ پردہ کس لیے ڈالا ہے یارب! درمیاں تو نے

بہارِ عارضِ گل سے لگا کر آگ گلشن میں
طیورِ صبح خواں کو کر دیا آتش بجاں تو نے

جوانی میں جسے بخشی دل آرائی و رعنائی
بڑھاپے میں اُسی عارض پہ ڈالیں جھرّیاں تو نے

کسی کو تا کہ اپنی سربلندی پر نہ غرّہ ہو
ازل سے کی نگوںساری نصیبِ آسماں تو نے

ترے دربار سے مجھ کو یہی انعام کیا کم ہے
مجھے اپنی ستائش میں کیا رطب اللساں تو نے

از شمس العلما مولوی نذیر احمد ایل ایل ڈی (اڈنبرا)

(۱) بوقت عطائے خطاب

بدلے گا اب بہار سے قطعاً خزاں کا رنگ
حاکم ہوئے ہیں صوبہ کے سر میکو ڈونلڈ ینگ

کیا حسنِ انتظام ہے بسمارک بھی اگر — جرمن سے آکے دیکھے تو ہو جائے عقل دنگ

اک نصف درجن آٹھوں سے گذرے ہیں لفٹنٹ — پر ان کے انتظام کے بالکل نئے ہیں ڈھنگ

انصاف اس کو کہتے ہیں عدل اس کا نام ہے — اک گھاٹ پانی پیتے ہیں بزغالہ و پلنگ

ہیبت تمہاری لشکرِ اعدا کو دے شکست — ظاہر کا ایک حیلہ ہے کیا توپ، کیا تفنگ

منظور ہو جسے کہ ہو ہر طرح کامیاب — بس تم سے آکے سیکھ لے تدبیرِ صلح و جنگ

قائل نہ تھے کسی کے مگر تم کو دیکھ کر — ہم ہو گئے ہیں معتقدِ دانشِ فرنگ

اب سن کے تم کو حاکمِ پنجاب خوش ہوئے — تھے اس سے پہلے اہلِ ہنر زندگی سے تنگ

مجھ کو ملا خطاب، تو ہے مجھ کو اس سے فخر — گو ہے خطاب کو مری نسبت سے عار و ننگ

ہر چند ہوں کمال و فضیلت سے بے نصیب — پر شکر ہے کہ طبع میں جودت ہے اور امنگ

کہتا نہیں مگر مجھے قدرت ہے نظم پر — لیکن نہیں ہوں دوسروں کی طرح سے دبنگ

لوہا نہیں ہے ذہن کی تلوار کا خراب — ہاں بیکاری کے سبب سے چڑھا ہے زنگ

عہدِ حکومت آپ کا یوں ہو مفیدِ ملک
سیراب جیسے کرتا ہے کھیتوں کو آبِ گنگ

۲ تقریب جلسہ مدرسہ طبیہ دہلی

کس قدر جلدی گذرتے ہیں جہاں میں ماہ و سال

کاش ہم کو بھول کر آئے کبھی اِس کا خیال
حال جتنے ہیں وہ ہو جائیں گے ماضی ایک دِن
جتنے مستقبل ہیں ہو جائیں گے وہ اِک روز حال
ہر منٹ اور ہر سکنڈ اِک آدمی ہے فی المثل
اُس کا ہو چکنا، گذر جانا ہے اُس کا اِنتقال
جلسۂ سالِ گذشتہ گویا کل کی بات ہے
جمع تھے جس میں تمامی شہر کے اہلِ کمال
صدر میں صاحب کمشنر جلوہ گر جوں ماہتاب
دوسرے حکّام گرداگرد تاروں کی مثال
وہ نہ تھا جلسہ مگر اِک کورٹ تھا بے اشتباہ
وہ نہ تھا جلسہ مگر دربار تھا بے قیل و قال
سکرٹری پڑھ رہے تھے کس فصاحت سے رپورٹ
باغ میں جس طرح چہکے طوطیِ شیریں مقال
ہر طرف سے مرحبا و آفریں کا شور تھا
ہو رہے تھے حاضرانِ جلسہ سُن سُن کر نہال
اور صفِ پائیں میں یہ عاجز کھڑا تھا سرنگوں
بے بضاعت، بے ہنر، نادم، سراپا انفعال

یوں ہوا اتنے میں ارشاد حکیم محتشم[1]
کیا کھڑا ہے آ ادھر آ اور جیب سے پرچہ نکال
ایسا لکچر دے کہ پا جائے ہمیشہ کے لئے
طبِّ یونانی و انگریزی کا جھگڑا انفصال
اُن کی اِس درخواست پر مَیں نے بھی وہ تقریر کی
جس کو سُن کر لوگ کہتے تھے کہ ہے سحر حلال
ایسی بے باکی سے بولے، کس کا اتنا حوصلہ
اِس صفائی سے کہے، کوئی کسی کی کیا مجال
کوئی کوئی معترض بھی تھے کہ یہ سب لغو ہے
بے دلیل و بے سند، اثباتِ دعویٰ ہے محال
گُل ہوا ہی چاہتا ہے طبِّ یوناں کا چراغ
اور یہ جو کچھ دیکھتے ہو آخری ہے اشتعال
یہ عمارت کُہنگی سے گَل کے آدھا ہو گئی
اب نہ جالینوس کے باوا سے ہو اس کی سنبھال
طبِّ یونانی و انگریزی، کہ دو بہنیں ہیں یہ
بے محابا مُدّتوں سے لڑ رہی تھیں بدخصال

[1] حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں مرحوم مراد ہیں ۱۲

گرچہ یونانی بڑی تھی ، پر نہ تھا اس کے تئیں
اپنی چھوٹی بہن کی پرداخت کا مطلق خیال
کوستی تھی اور یہ کہتی تھی کہ " تو ہو جائے رانڈ
ٹکڑے روٹی کے لئے کرتی پھرے گھر گھر سوال"
چھوٹی کھوٹی ترے سے بول اٹھی کہ " بس بک بک نہ کر
تیرے مٹ جائیں چہیتے اور ترے مر جائیں لال"
جب کہ دونوں میں ہوئی تکا فضیحت اس قدر
اٹھ گیا دونوں طرف سے پاسِ حدِّ اعتدال
بارے دونوں کو کسی ڈھب سے گلے ملوا دیا
ورنہ ہوتی خاندانِ طب کی رسوائی کمال
دور ہو کر رنجشیں ، پھر ہو گیا گہرا ملاپ
اب تو سننے میں نہیں آتی کبھی جنگ و جدال
امن سے اک ہی جگہ میں دونوں گھر آباد ہیں
نے حسد ہے ، نے گلہ ، نے شکوہ ، نے رنج و ملال
کوئی کرتا ہے تدید ی اور نفیسی کی چھتاڑ
کھینچتا ہے چیرہ دستی سے کوئی مردے کی کھال
مدرسہ طبّیہ اپنی شان میں ہے منفرد

کیجیے تسلیم، یا دکھلائیے ایسی مثال
درسِ طب، اور درسِ طب کے ساتھ حسنِ انتظام
تجربہ، اور تجربہ کے ساتھ اُس کی دیکھ بھال
حیف ہے، صد حیف، گر اس کی نہ کی جائے مدد
ظلم ہے، گر دستگیر اِس کا نہ ہو دستِ نوال
یہ ابھی تک صرف منصوبے ہیں دُور از واقعات
جیسے کوئی خواب دیکھے یا کرے دِل میں خیال
ڈالنے کو گڑ نہیں پیدا ہو پھر کیسے مٹھاس
یا سُنے ہیں آپ نے بے دُودھ بنتے شیر مال
وقفِ تفریحاتِ لایعنی ہے جو ہے جس کے پاس
پر نہیں ہے قوم کے کارن کوئی کوڑی دِوال
قوم کے سر میں مگر احساسِ حالت ہی نہیں
پڑ رہا ہے مُدّتوں سے مُلک میں قحط الرِّجال
اک سرے سے آ گیا ہے سب کی عقلوں میں فتور
یا دماغوں کی بناوٹ میں ہے داخل اختلال
انقلابِ دہر کو لوگوں نے سمجھا ہی نہیں
کیا نتیجہ ہو گا، کیا انجام ہو گا۔ کیا مآل

حاکمانِ وقت کی ہر چیز سے کُلّی گُریز
وضع ہو، یا طرز ہو، یا علم ہو، یا بول چال
ہو چُکا سیراب ساری عُمر ایسا تشنہ کام
جو پھرے سرگشتہ، دور از چشمۂ آبِ زلال
بود و باش بحر اور اُس پر مگر سے دُشمنی
بد نصیبی اس کو سمجھو، یا حماقت، یا ضلال
جیسے اک تنکا مُقابل ہو کسی سیلاب کے
جیسے کوئی توپ سے لڑنے کو جائے لے کے ڈھال
بُرد کیسی آ پڑا ہے صاف نقشہ مات کا
اِبتدا ہی سے غلط ہوتی گئی بازی میں چال
گر کسی کو شاذ و نادر ہے بھی انگریزی کا شوق
فرسٹ ریڈر پڑھ کے بننا چاہتا ہے کوتوال
یا بنا کر اوپری باتوں میں انگریزوں کی نقل
وہ مَثَل ہے، ہو کے کوّا ہنس کی سیکھا ہے چال
یہ نِکھٹّو لا نہیں سکتا کما کر اک درم
ہاں اسے دید و اُٹھانے کو ونا شیر و ریال
ہو گئی ہیں رسّیاں جل جل کے سب خاکِ سیاہ

لیک نکلے ہوں کسی کے بل چلے پر کیا مجال
نازشِ بے جا بڑوں پر اور خود نا اہل ہیں
راگنی بے وقت کی، بے تک نہ اس میں سُر نہ تال
اُٹھ گئی دنیا سے رسمِ اتحاد و یک دلی
اور اسی نا اتفاقی کے ہیں یہ سارے وبال
اب یہ حالت ہے کہ گویا ایک کا دشمن ہے ایک
بس چلے اور دسترس پائے تو کر ڈالے حلال
ایسے سفاکوں سے کس کی آبرو محفوظ ہے
شِیرِ مادر ہے، جو پا جائیں کسی کا مفت مال
طیبات العیش سارے لے گئے اگلے بزرگ
پچھلوں کو رہ گئے ہم نا خلف رنج و ملال
کیا ہوا ہم میں اگر آسودہ ہوں بھی بعض بعض
کیا ہوا ہم میں اگر خوشحال ہوں بھی خال خال
بالیقیں آدھے سے زائد مبتلائے مخمصہ
جن کو جو کچھ وقت پر مل جائے کھا لینا حلال
دن کو کھا لیتے ہیں موٹا جھوٹا آدھے پاؤ پیٹ
رات کو فاقے سے سو رہتے ہیں سب اہل و عیال

یا گھروں سے ہو کے مضطر عورتیں پردہ نشیں
بھیک کی خاطر، نکل پڑتی ہیں بُرقع سر پہ ڈال
اِس قدر دُبلے، کہ تن پر نام کو بوٹی نہیں
حلقے آنکھوں میں پڑے، پچکے ہوئے اندر کو گال
ہڈّیوں کے ڈھانچ باقی رہ گئے ہیں سُوکھ کر
پیٹ دیکھو کھول کر، جیسے کوئی خالی کھال
وقت تھوڑا طبع نازک، داستانِ غم دراز
اب دعا کے ساتھ ہونا چاہیئے خَتمُ المقال
اے خُدا! سارے جہاں کا خالق و رازق ہے تو
اے خُدا! ہے ذات تیری لَمْ یَزَل اور لَا یَزَال
مشکلوں نے ہم کو آگھیرا ہے چاروں سِمت سے
ہم کو گردش نے فلک کی کر دیا ہے پائمال
مدرسہ طِبیّہ جس میں آج ہم سب جمع ہیں
یہ بھی ہے حق میں ہمارے اِک طرح کی نیک فال
یعنی کچھ دِن پھر چلے ہیں طالعِ ناساز کے
کیا عجب وہ شاید ہمیں بیضہ بر آرد پرّ و بال"
یہ اور اِس کے ساتھ وابستہ ہیں جتنے کاروبار

سب کو استحکام دے پروردگارِ ذوالجلال!
آپ ملکی لارڈ ہو کر ہوں ہمارے سرپرست
جل مریں پھر مدرسے کے حاسدانِ بدسگال

از مؤلف

تہنیت جشن جوبلی حضور ملکۂ معظمہ وکٹوریا قیصرِ ہند

ہے خداوند حقیقی کو سزاوار سپاس
جان نے تن میں کیا حکم سے جس کے اجلاس
پارلیمنٹ کھلی کشورِ دل کے اندر
عقل نے تخت کی اسپیچ پڑھی پیش حواس
ایسے دربار مقدّس میں اُسے بار ملا
جس کا دانش کے لونڈر سے معطّر تھا لباس
تہنیت نامہ سنانے کو بہ تعظیم ادب
حاضرِ بزم ہوئے ذہن و ذکا، فکر و قیاس
مالکُ المُلک ہے تو اور عزیز و جبّار
تو ہی خلّاق ہے۔ رزّاق ہے۔ اور ربُّ النّاس

صحنِ عالم میں کیا خیمۂ اطلس برپا
جس میں قدرت نے جڑے گوہر و لعل والماس
دشت و کہسار کو دی سبزہ و گل سے زینت
سامنے جن کے لگیں لعل و زمرّد بھی اُداس
شاخِ اشجار میں لٹکائے ثمر رنگا رنگ،
جن میں حکمت نے کیا جمع مٹھاس اور کھٹاس
تاکہ دامانِ زمیں تازہ و شاداب رہے،
تو نے رکھّا کمرِ کوہ پہ چشموں کا نکاس
تو نہ مٹّی سے اُگاتا جو چنے اور گیہوں
خاک سے کرتا مہیّا جو نہ سن اور کپاس
کون کر سکتا یہ پُر ذائقہ کھانے تیّار
کون بُن سکتا یہ پُر زیب رِدا اور لباس
تیری رحمت کے طلبگار ہیں سب شاہ و گدا
تیری حکمت نے حریر اُس کو دیا، اِس کو پلاس
تیری قدرت ہے قوی، حکم ہے تیرا ناطق
ہے بھلا نقدِ بقا تیرے سوا کِس کے پاس
آج اورنگِ سلیمانؑ ہے نہ تختِ بلقیس

کشتیِ نوحؑ کا تختہ، نہ گلیمِ الیاسؑ
نامِ نیک اُن کا ہے افواہ میں اب تک مذکور
ہاں! مگر عزّت و وقعت کا یہی ہے مقیاس
بہرہ ور تاجوری سے وہی ذی ہوش ہوا
تیری خلقت کا کیا جس نے دل و جان سے پاس
سُن کے اِس نامۂ پُر مغز کا مَیں نے مضموں
اَور بھی اِس کے تتمہ میں لکھے شعر پچاس
ہند پر قیصرِ عادل کو تسلّط بخشا
کس زباں سے ہو تری حمد و ثنا شکر و سپاس
مُلک کو تو نے نئے سر سے کیا پھر سرسبز
تیری رحمت سے نہ ہو غم زدہ کوئی بے آس
دُور از حال تباہی کی گھٹا چھائی تھی،
سَیل کی طرح سے، طغیانی پہ تھے خوف و ہراس
بن گیا تھا چمنستان سے چٹیل میداں
بیل بوٹے تھے، نہ اشجار، نہ پھل، پھول، نہ گھاس
شاہِ گلشن تھی مغیلاں، تو ولیعہد تھے خار
لالہ و سوسن و نسریں کو رلا تھا بن باس

باغِ شاہنشہی ہند میں آئی تھی خزاں
چیل کوّے تھے مگن، بلبل و طوطی تھے اُداس
آلِ تیمور کے خورشید کا تھا وقتِ غروب
شامِ ادبار کی ظلمت سے دلوں میں تھی یاس
ضُعفِ پیری سے حکومت کا لبوں پر دم تھا
نہ تو اوسان ٹھکانے تھے، نہ قائم تھے حواس
تھے جُدا سلطنتِ ہند کے ریزے ریزے
جیسے چیونٹوں کی جماعت میں ہو تقسیم مٹھاس
مرزبانوں کے سروں پر نہ تھا کوئی سرتاج
جان اور مال کا تھا حفظ نہ ناموس کا پاس
غوری و خلجی و تغلق کے مٹے تھے دستور
شیر شاہی کی روش تھی، نہ حصارِ رُہتاس
نام تھا نظم و نسق کا، نہ سیاست کا نشاں
اکبری دَور کی باقی نہ رہی تھی بُو باس
پرتگیز اور دلندیز و فرانسیس بھی تھے
ملک گیری کی جنھیں بھوک تھی۔ اور مال کی پیاس
جب کلائیو نے پڑھی سیف و قلم کی سیفی

کچھ گھٹے ہند کے دل سے خفقان و وسواس
فرشِ دولت کی لگی ہونے نئی قطع و برید
پھٹ چلا جنگ پلاسی سے وہ پارینہ پلاس
ہیسٹنگز اور ولزلی نے عجب کام کیے
نبضِ دولت کے یہی لوگ تھے رفتار شناس
چارہ فرما ہوئے ڈلہوزی و ولیم بنٹنگ
آ گئی طبعِ ممالک کو دوا اُن کی راس
ہند میں کوکبِ انگلش نے کیا خوب عُروج!
جس کے مشرق تھے یہ کلکتہ و بمبیٔ۔ مدراس
اس صدی کے گئے جس وقت کہ سینتیس ۳۷ برس
فورتھ ولیم کی ہوئی ختم شمارِ انفاس
ہر مجسٹی دی کوئن وارثِ تاج و دیہیم
تختِ برٹش پہ ہوئی زیب فزاے اجلاس
کمپنی ہند کی ملّاح رہی مُدّت تک،
لائی پھر غدر کا طوفان ہواے وسواس
غدر کے بعد ہوا دورۂ شاہی آغاز
نیرِ دولت و اقبال چڑھا سمت الراس

پھر نئے سر سے ہُوا کا رُخ حکومت ترہیم
قیصری قصر کی ہونے لگی مضبوط اساس
اے! ترے تاج میں انصاف و عدالت، گوہر
اے! ترے تخت میں احسان و محبّت، الماس
عفوِ تقصیر کا جاری کیا تو نے منشور
بن گئے جانِ تنِ ہند کو تیرے انفاس
تیری دولت کے مُدبّر تھے فلاطون زمن
کھو دیا سب جگرِ مُلک سے درد و آماس
کھُل گیا سطحِ حکومت کا نشیب اور فراز
حسنِ تدبیر کی جس وقت لگائی کمپاس
کر دیا ہند کے اجزائے پریشاں کو بہم
جڑ گیا ٹوٹ کے پھر نظم و سیاست کا گلاس
امن و انصاف کا پڑھنے لگے سب مل کے سبق
حاضرِ اسکولِ اطاعت میں ہوئے جملہ کلاس
سندھ ہے ایک طرف، دوسری جانب برہما
قاعدہ کوہ ہمالہ، تو کماری ہے راس
عہدِ دولت سے ترے پائی دلوں نے تسکیں

سکۂ زر کی طرح چل گیا تیرا قرطاس
ہیں ہنر تیرے زمانے کے بغایت روشن
روغنِ موم کی جا جلنے لگی برق اور گاس
تار کے سامنے یکساں ہے ، نہ کچھ دیر نہ جلد
ریل کے آگے برابر ہے نہ کچھ دور نہ پاس
گانوں در گانوں ہوئیں علم کی نہریں جاری
تاکہ سیراب ہوں لب تشنہ ، بجھے سب کی پیاس
اکثر اضلاع میں کھلتی ہیں نمائش گاہیں
جمع ہوتی ہیں جہاں مُلک کی صنعی اجناس
گائے ، بکری کی نہ ہوتی تھی جہاں پر بکری
اب وہاں تازی و تُرکی کے ہیں لگتے نخّاس
بحر و بر میں ہے ترے زیر نگیں جتنا مُلک
نہیں از روے یقیں اور کسی شاہ کے پاس
بحرِ اعظم میں مہابت ہے ترے بیڑے کی
برِّ اعظم میں تری فوج سے دشمن کو ہراس
مملکت میں تری چھپتا نہیں سورج زنہار
ہے یہ جغرافیہ کی رو سے بہت ٹھیک قیاس

جشنِ جُبلی کا ہوا غُلغلہ برپا گھر گھر
خیر سے تختِ نشینی کو ہوئے سال پچاس

تیری دولت کی دُعایوں ہے دلوں سے جاری
جیسے گنگوتری کے چشمے سے گنگا کا نکاس

وہ خداوند تجھے دے سندِ عُمرِ طویل
جس کی قدرت کی کچہری میں مہ و خور ہیں چپراس

از مولوی عبد الکریم سوز دہلوی

قطع دوستی کا افسوس

یاد ایام کہ باہم تھی محبت منظور
دل کے ارمان مرے رہتے تھے سب پاس ہی پاس
دل میں ہوتی تھی نہ اس طرح کی سوزش پیدا
میرے سینے میں جو تھا عیش تو تھا عیش مثال
جان کو پلتے تھے جو تن میں تو بصد عیش و نشاط
یک قلم محو ہوا تھا یہ غم و درد و الم
اور دریائے مسرت میں یہ تھی موج زنی
جانِ حاسد پہ برستی تھی پڑی نار پہ نار

عیش و عشرت ہی سے رہتا تھا سدا دل معمور
یاس و افسوس سدا پاس سے تھے دُور ہی دُور
جان رہتی تھی خنک اپنی مثالِ کافور
تھا وہ گنجینۂ عشرت تو یہ اُس کا گنجور
دل کو جب دیکھتے سینے میں تو کیا کیا مسرور
کہ ٹھکانا ہی نہ لگتا تھا کہیں پاس نہ دور
عشرت و عیش کا اس طور سے تھا جوش و فور
دل پہ یاں اپنے اُترتا تھا سدا نور پہ نور

اِتنی سی بات پہ آپے سے گئے اپنے نکل — اتنے سے عیش پہ ہم ہو گئے کیسے مغرور
اتنی جمعیّتِ خاطر پہ لگے یوں کہنے — کہ "کوئی ہم کو پریشان کرے کیا مقدور"
اور نہ سمجھے کہ زمانہ ہے بڑا شعبدہ باز — اِس کے آگے نہیں چلتا ہے کسی کا بھی غرور
دیکھتا ہے کہیں جس خانۂ دل کو آباد — اُس کے ڈھا دینے میں کرتا ہی نہیں ہے قصور
خاک میں جس کو ملایا نہ رکھا نام و نشاں — نہ رہا روم میں قیصر، تو نہ چیں میں فغفور
ہوتے اِس کے ستم و جور سے کیونکر آگاہ — پاتے کس طرح سے اِس شعبدہ بازی پہ شعور
کبھی جورِ فلک سے نہ ہوئے تھے عاجز — اور کبھی قہر سے اُس کے نہ ہوئے تھے مقہور
کبھی گردابِ الم میں نہ پڑے تھے آکر — نہ کیا تھا کبھی دریائے صعوبت سے عبور
یاں بھی آخر وہی کی شعبدہ بازی آغاز — کہ ہر اک اپنی ہے عادت سے جہاں میں مجبور
میرا آزار اُنھیں ٹھہر گیا "مدِّ نظر" — میری ایذا ہوئی ہر طرح سے اُن کو منظور
شہد کا شہد گیا ہاتھ سے اپنے ہیہات — اور چبھے سفت رگِ جاں میں نیشِ زنبور

تشبیب قصیدۂ سودا

گُل حرص نام تجھ سے سودا پہ مہرباں ہو — بولا نصیب تیرے سب دولتِ جہاں ہو
گر اشرفی روپے کی خواہش ہو تیرے دل میں — ظاہر ترے[1] پہ ہر جا گنجینۂ نہاں ہو
لعل و گہر کی ہووے تجھ کو اگر تمنّا — مصرف کے بیچ[2] تیرے اشیائے بحر و کاں ہو
عمدہ تو اِس قدر ہو، سرکار بیچ تیری — مور و ملخ سے زیادہ[3] خیلِ ملازماں ہو

۱۔ "تیرے پہ ظاہر" متروک۔ اس کے بجائے "تجھ پر ظاہر ہو" کہتے ہیں ۱۲ ۔ ۲۔ یہ ترکیب متروک ہوگئی اب "مصرف میں" بولتے ہیں ۱۲ ۔ ۳۔ زیادہ کی "ی" ساقط ہوتی ہے اُس زمانہ میں اسی طرح بولتے تھے مگر اب خلافِ فصاحت ہے ۱۲

جاہ و جلال یاں تک دیوے[۱] تجھے زمانہ
جب ہو تری سواری صد فیل پر نشاں ہو

گر ملک چاہتا ہو تو تحت بیچ[۲] تیرے
ہندوستاں سے لے کر اور[۳] تا با صفہاں ہو

آگے تو کیا کہوں میں دل چاہتا ہے تیرے
قبضے میں لے زمیں سے اور تا با آسماں ہو

سن کر یہ حرف بولا سودا کہ قدر و رتبہ
کب اشرفی روپیہ کا نزدیک عاقلاں ہو

یہ تو بڑے ہیں اتنے آفاق میں کہ جن کو
کیسہ سے دور کیجے کام اپنا تب رواں ہو

لعل و گہر جو پوچھو پتھر ہیں اور پانی
رتبہ نہ ان کو پیش ارباب ہمتاں[۴] ہو

عمدہ تو وہ کوئی ہے نزدیک فہم جس کی
اہل[۵] کمال آگے دنیا میں عز و شاں ہو

نام نکو سے بہتر دنیا میں کیا نشاں ہے
وہ بھی کوئی نشاں ہے جو فیل پر رواں ہو

ملکوں کی سرزمیں سے حاصل یہی ہوا آخر
دو مشت خاک جس میں اک مشت استخواں ہو

ارض و سما کا ہونا قبضے کے بیچ اپنے
بے دعوی خدائی کیونکر مجھے گماں ہو

جو کچھ کہا ہے تو نے یہ تجکو سب مبارک
میں اور میرے سر پر میر بسنت[۶] خاں ہو

۱؎ اب دیوے کے بجائے دے بولتے ہیں ۲؎ اب اس موقع پر "دیں" بولتے ہیں ۳؎ "اور" زائد ہے۔ محاورۂ حال میں جائز نہیں ۴؎ اب یہ جمع جائز نہیں۔ ارباب ہمت میں موصوف یعنی ارباب خود جمع ہے ۵؎ "اہل کمال آگے" پرانا متروک محاورہ ہے اب علامت اضافت کا ترک جائز نہیں" یعنی اہل کمال کے آگے" بولنا چاہیے ۶؎ بسنت خاں بادشاہی خواجہ سرا اور بڑا صاحب اقتدار تھا اور مرزا سودا کا بڑا قدر دان مربی تھا

قطعات

از مولوی عبد الکریم سوزؔ دہلوی

تاریخ وفات استاد ذوقؔ

صبح دم نکلا میں اپنے گھر سے با آہ و فغاں — ذوقؔ کے مرنے کا جب مشہور افسانا ہوا
لب پہ نالہ دل میں غم سینے میں دردِ جاں گداز — اِس طرح تیغِ الم کا ہے ہر اک مارا ہوا
پاک تھا وہ آپ، ذاتِ پاک ہی میں مِل گیا — نور تھا وہ، نور ہی میں جا کے پوشیدا ہوا
ایک جوہر تھا کہ وہ معدن میں جا کر چھپ رہا — ایک قطرہ تھا کہ جا کر واصلِ دریا ہوا
کیا کہوں میں اُس کے جیتے جی جہاں میں کون کون — دشمنِ جانی بنا اور درپئے ایذا ہوا
اب جو وہ سوئے عدم راہی ہوا تقدیر سے — ہر کسی کے لب پہ حرفِ افسوس کا پیدا ہوا
سینہ بریاں، دیدہ گریاں، دردِ دل، دردِ جگر، — کیا کہوں میں سانحہ سے ذوقؔ کے کیا کیا ہوا
صرف مجھ ہی کو نہیں کچھ اُس کے مرنے کا الم — یہ غم و اندوہ تو سارے میں ہے پھیلا ہوا
قصہ کوتہ کب تلک اب کیجئے دُول کلام — اُس کا مرنا تو قیامت کا نمونہ سا ہوا
گذرے ہیں دُنیا میں کیا کیا شاعرانِ باوقار — اِس قدر رنج و الم کس کس کے مرنے کا ہوا
اُس کے مرنے کا یہاں تک غم ہوا سب کو کہ اب — ہر کوئی تاریخ میں اس کی سخن آرا ہوا

ذوق کا صدمہ ہر اک صدمے سے ہے جانکاہ تر
موج زن مرنے سے اُس کے رنج کا دریا ہوا

کیا کہوں کس کس طرح دل کو پریشانی ہوئی
کیا لکھوں جس جس طرح سے جان کو سودا ہوا

ہائے! کیا گل تھا کہ جس سے تھا شگفتہ باغِ دہر
ہائے کیا بو تھی کہ تھا جس سے چمن مہکا ہوا

اب تو چپ ہی بیٹھے رہنا ہے مناسب ہر طرح
جب کہ اپنے پاس سے گم وہ سخن آرا ہوا

یہ تو وہ غم ہے کہ اس کے صدمۂ جانکاہ سے
دم میں سو سو طرح سے عالم تہ و بالا ہوا

کون فرمائے گا ہم پر مہربانی اس طرح
تھا عجب اُستاد وہ، یک بار ناپیدا ہوا

سوز سے میں نے کہا تو کس لئے خاموش ہے
ایک عالم جب کہ ہے اِس میں سخن آرا ہوا

تو بھی تاریخِ وفاتِ ذوق کی کچھ فکر کر
ہو کے شاعر بزم میں تو کس لئے چپکا ہوا

بس کہ تھا وہ صاحبِ فکرِ رسا فوراً کہا
دیکھتے ہی دیکھتے اب یار کیا سے کیا ہوا
۱۲۷۱ھ

یہ تو میں کہتا نہیں لے دل کہ مرنا ذوق کا
نا درست و نامناسب اور نا زیبا ہوا

کیونکہ یہ باتیں بسببِ خواہشِ تقدیر ہیں
گفتگو اس امر میں، تقدیر سے لڑنا ہوا

یاد آیا ہے کہ بستے تھے یہاں عیش و نشاط
اب تو کوچہ کوچہ دہلی کا الم خانہ ہوا

وہ ہی دہلی تھی کہ ہر ہر طرف سے آباد تھی
وہ ہی دہلی ہے کہ ہر ہر گھر ہے اب اُجڑا ہوا

ایک اک ذرہ یہاں کی خاک کا تھا عشق خیز
جس جگہ اب درد اور اندوہ کا صحرا ہوا

قصہ کوتہ، جب کہ میر و درد و سودا مر گئے
اور اُن کے مرنے سے اک حشر سا برپا ہوا

سرزمینِ جنتیِ سخن کی تھی سو ویراں ہو گئی
گویا پہلا وہ عالم ہی تہ و بالا ہوا

از سرِ نو پھر ہوا تعمیر کے در پے فلک
اس خرابہ کی، کہ تھا یکسر وہ ویرانہ ہوا

یعنی اِقلیمِ سخن پھر ہوگئی آبادسی
شاعری و شعر کا پہلا سا پھر چرچا ہوا

جب کہ اِک اُستاد سے ہر وقت میں ہے ناگزیر
شیخ ابراہیم ذوقؔ اُستادِ شہ پیدا ہوا

بادشاہ قدرداں بھی بسکہ تھا رُتبہ شناس
اُس پہ اپنی مرحمت سے وہ کرم فرما ہوا

اور عنایت کرکے "خاقانیٔ ہند" اُس کو خطاب
نکتہ سنجوں کی نظر میں یوں شرف افزا ہوا

کون سی جا تھی کہ اُس کا واں تھا نامِ بلند
کون سا گھر تھا کہ اُس کا واں نہیں شہرا ہوا

تا دمِ آخر اِسی در پر رہا وہ جانشیں
یہ ہی کوچہ اُس کا گویا مسکن و ماوا ہوا

عُمر کو اپنی یہیں اُس نے گزارا سربسر
جب تلک راہی یہاں سے جانبِ عقبیٰ ہوا

از فصیح الملک جہاں اُستاد نواب مِرزا داغؔ دہلوی

آموں کا شکریہ

شاہ نے دیں آم بھر بھر کشتیاں
بحرِ عطا کیا ہی ہوا موج زن

کشتیوں میں آم جو ہیں رنگ رنگ
داغؔ کا گھر آج ہے رشکِ چمن

سُرخ میں ہے لالہ رنگوں کی بہار
سبز میں ہے سبز خطوں کی پھبن

زرد میں ہے رنگِ گُلِ زعفراں
کیسری پوشوں کی ہے اک انجمن

طوطا پری، لال دیا، دِل پسند[1]
کہتے ہیں نامی اسے اہلِ دکن

[1] یہ نام ہیں آموں کے ۱۲

آم ہرا، جامِ زمرّد کی شکل — لال دیا، صورتِ لعلِ یمن
سُونگھ کے ہو جائے معطّر دماغ — مُنھ پہ مگر اُن کے ہے مُشکِ ختن
گر کبھی اِن آموں کا رس چوس لیں — ہونٹ ہی چاٹا کریں شیریں دہن
انبۂ شیریں جو اُسے ہو نصیب — نام بھی شیریں کا نہ لے کوہکن
یہ ہی تو ہیں جنّتِ دُنیا کے آم — اِن کا ہی مصلح ہے بہشتی لبن
سیکڑوں قسمیں اِسی میوہ کی ہیں — پھر ہے یہ افراط کہ لاکھوں ہی من
واقعی اِن آموں کی تعریف میں — کم ہے جہاں تک کہیں اہلِ سخن
قاش بنے اِس کی جو اپنی زباں — قند کا کوزہ بنے اپنا دہن
دیکھیے شیرینیٔ گفتار پھر — نطق بھی چپکے دمِ عرضِ سخن
پھُولے پھَلے شاہ کا باغِ مُراد — اور ثمریاب ہوں اہلِ زمن
فیض رساں داغؔ کو یا رب رہے — خسروِ محبوب نظامِ دکن

از خان بہادر سیّد اکبر حسین اکبرؔ

علم

(۱)

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی رُوح — بے علم ہے اگر تو وہ اِنسان ہے ناتمام
بے علم بے ہُنر ہے جو دُنیا میں کوئی قوم — نیچر کا اقتضا ہے رہے بن کے وہ غلام
تعلیم اگر نہیں ہے زمانے کے حسبِ حال — پھر کیا اُمیدِ دولت و آرام و احترام

انقلاب

(۲)

انقلابِ جہاں کو دیکھ لیا
کل کلی کھل کے ہو گئی تھی پھول

حُبِّ دُنیا سے قلب پاک ہُوا
پھول کملا کے آج خاک ہُوا

صبر و قناعت

(۳)

ہے صبر و قناعت اک بڑی چیز، اکبرؔ
دنیا طلبی کے وعظ میں محو ہے تو،

لذّت ابھی اُس کی تو نے چکّھی ہے کہاں
یہ بھی تو ذرا سمجھ کر رکھّی ہے کہاں

ترکیب بند

از شمسُ العُلما مولانا خواجہ الطاف حُسین (حالیؔ)

تعصُّب

(۱) سہل مت سمجھو تعصّب کو بُری ہے یہ بلا
حکم ہے اس کا کہ فاقہ ہے، تو فاقہ میں مرو
حکم ہے اس کا کہ کوئی قوم جس حالت میں ہے

کر دیا ہے اس نے قوموں اور گھرانوں کو فنا
اور جو ذلّت ہے، تو ذلّت پر رہو قانع سدا
بس وہی ہے اُس کی عزّت اور شرف کی انتہا

باپ دادا جو گئے ہیں چھوڑ یاں رسم و رواج
نا خلف ہے ایک اپنا اُس سے اگر آگے بڑھا

آدمؑ و حوّا نے گرتّوں سے ڈھانکا تھا بدن
نسل میں اُن کی وہی پوشش ہے جاری سدا

نوحؑ کی کشتی میں تختے تھے اگر اُن گھڑ لگے
ہوں جہاز اب بھی اُسی کینڈے کے بے چون چرا

آدمی کا گھر ہو ایسا ہی پُرانی چال کا
لومڑی کا جیسے بھٹ ہے اور بئے کا گھونسلا

ایک کا نام آدمی ہو، ایک کا ہو جانور
آدمی اور جانور میں ہو نہ فرق اِس کے سوا

باپ دادا کے لیے بیٹھے ہو کیا رسم و رواج
وہ گئے اور دم کے ساتھ اُن کا دمامہ بھی گیا

دیکھو تم گرتے چلے جاتے ہو پستی کی طرف
آگے آتا ہے گڑھا بعد اِس کے ہے تحت الثریٰ

گر گرو زیر ایسے دُشمن کو تو ہے مردانگی
جو اُبھرنے کی نہیں دیتا تمھیں پروانگی

دُنیا عالمِ اسباب ہے

دوستو! انکار اگر تم کو بداہت کا نہیں (۳)
عالمِ اسباب ہے دُنیا اسے جانو یقیں

کاہ سے لے کوہ تک ذرّہ سے لے تا آفتاب
سب کو ہے جکڑے ہوئے اسباب کی حبل المتیں

اِک مرتّب سلسلہ پاؤ گے واں اسباب کا
دشت میں تپتا بھڑکتا تم اگر دیکھو کہیں

یوں خدا چاہے تو لے اسباب کی تاثیر چھین
لیکن اُس قیّوم بے ہمتا کی یہ عادت نہیں

بھاپ اُٹھے گی سمندر سے تو اُمڈے گی گھٹا
آسماں برسے گا جب اُگلے گی تب دولت زمیں

ہے یہ وہ قانونِ محکم مالکِ مختار کا
جو کہ سطحِ خاک سے نافذ ہے تا چرخِ بریں

وہ یہی قانون ہے جس سے لگا لیتے ہیں کھوج — وقت سے پہلے ہر اک انجام کا انجام بیں
جان لیتے ہیں کہ آمد ہے خزاں کی باغ میں — ٹہنیوں سے خود بخود جب پتّیاں جھڑنے لگیں
دیکھ لیتے ہیں کہ جس گھر کی ہے پانی پر بنا — کوئی دن میں وہ رہے گا ہو کے پیوندِ زمیں
بس کہ ہے اُن کو قوانینِ الٰہی پر وثوق — اِس لئے رکھتے ہیں اپنی پیش گوئی پر یقیں

دیکھتے ہیں روشنی جب دن کی وہ جاتی ہوئی
اُن کو آنکھوں سے نظر آتی ہے رات آتی ہوئی

صفتِ کشمیر

(۱)

شہر ہے جو مرکزِ کشمیر مانندِ طلسم — طرفہ کیفیت سی ہے لہروں میں دل کی جلوہ گر
دیکھتے ہیں آبِ صافی میں جب اُس کا انعکاس — دوسرا وینس۱؎ کا نقشہ صاف آتا ہے نظر
باغِ شالامار جو رونق فزا ہے اُس کے پاس — ہے وہ اِک نیرنگِ قدرت کا تماشا سربسر

سبزہ و نسرین و گُل کی سرزمیں کہیئے اُسے
صفحۂ گیتی پہ یا خُلدِ بریں کہیئے اُسے

(۲)

فی المثل تختہ زمرد کا ہے واں اک سبزہ زار — سایہ افگن اِس طرح ہیں ہو بہو اُس پر چنار
جھیل کے چاروں طرف جس طرح آتے ہیں نظر — زیر و بالا اونچے نیچے گھر قطار اندر قطار
ہے غرض تیرے بنانے سے یہ اے باغِ نسیم! — باغِ جنّت کا نہ اِنساں کو رہے کچھ انتظار

۱؎ اٹلی کا مشہور شہر جس کے اندر سڑکوں کے بجائے نہریں جاری ہیں۔

چوٹیاں پربت کی ہیں یوں برف میں لپٹی ہوئی — جا بجا گو یا کھڑے ہیں دیو اور جن پہرہ دار

اُن کی رفعت اور بلندی کی نہیں کچھ انتہا — سینۂ گردوں سے گویا اب نکل جائیں گے پار

روزِ روشن ہیں جب اُن کا جھیل پڑ پڑتا ہے عکس — نقرئی پانی کی اُس کے پھر کوئی دیکھے بہار

(۳)

جنت اے کشمیر! کوئی تجھ سی دنیا میں نہیں — تو نہیں دیتا بھٹکنے اپنے طالب کو کہیں

ہر چمن یاں پھول سے اور پھل سے مالا مال ہے — ہر چمن میں یاں مُہیّا ہیں مکاں بہتر کہیں

اِن مکانوں و خیابانوں سے جب آگے بڑھے — پھر وہ عالم ہے جہاں غیر از خموشی کچھ نہیں

جیسے ہوتا ہے ابد پر دقت جا کر منتہی — ختم ہو جاتی ہے دُنیا بھی یہاں آکر یونہیں

یعنی اقلیم ابد اور یہ جہانِ خامُشی — طاقتِ انساں کی حد سے ہیں پرے دونو کہیں

طرفہ سنّاٹا ہے اس سُنسان کوہستان پر — جس کی دُنیا میں نہیں تمثیل کوئی دل نشیں

ہیں سراسر ناپدید آثارِ انسانی یہاں
مُنہ لپیٹے ہیں پڑے اسرارِ یزدانی یہاں

از مولوی ظفر علی خاں۔ بی۔ اے

طوفان عظیم حیدر آباد دکن ۱۹۰۸ء

(۱)

او نامراد ندی تجھ پر غضب خدا کا — لُوٹا ہے تو نے تختہ یارانِ آشنا کا

ہم سے تو یہ وفائیں اور تجھ سے یہ جفائیں — بدلا دیا ہے تو نے اچھا ہمیں وفا کا

اچھا کیا ادا حق ہمسائگی کا تو نے — ہم تجھ سے لَو لگائیں تو نے ہمیں کو تاکا

اِک کاروانِ آصف اُترا ترے کنارے — او ناسپاس! تو نے ڈالا اُسی پہ ڈاکا
تیری ہر ایک ٹکر، داعی بنی اجل کی — تیرا ہر اک تھپیڑا، قاصد بنا قضا کا
منجدھار میں ہے کشتی ٹوٹا ہوا ہے لنگر — سر پر ہے رات کالی، طوفان ہے بلا کا
تقدیر ہنس رہی ہے، تدبیر رو رہی ہے — مورد ہو ناخدا کیوں الزام ناروا کا
سب ہے شبِ قیامت، دن ہے حساب کا دن — وقت آگیا سزا کا، عہد آگیا جزا کا
خالی اُمید کا گھر، دروازہ توبہ کا بند — آئے اثر کہاں سے موقع نہیں دعا کا

اس واقعے کا ماتم برسوں بپا رہے گا
کانٹا ہر ایک دل میں غم کا چبھا رہے گا

(۲)

اُمڈی ہوئی ہے ندی چھایا ہوا ہے بادل — باڑھ اس قدر بڑھا ہے سب ہو گیا ہے جل تھل
ہے شب نے دن دہاڑے اندھیر ڈال رکھا — خورشید خاوری ہے ابرِ سیہ کے اوجھل
اک بارگی گئے کھل گردوں کے سب دریچے — بادل چلا ہے بن کر طوفاں کا ہراول
قدرت کی طاقتوں کو دستِ قضا ہی روکے — انساں کی کوششیں ہیں بیکار اور معطّل
غصّہ کا ہے یہ عالم کف در دہاں ہے ندّی — وقفِ شکن ہے ابرو ماتھے پہ ہیں پڑے بل
جوش و خروش اس کا ہر لحظہ بڑھ رہا ہے — سہمی ہوئی ہے خلقت ہوش و حواس ہیں شل
ساحل پہ گھر ہیں جن کے وہ دل میں کہہ رہے ہیں — مرنا ہمیں ہے آخر مرنا ہمیں ہے اوّل
پانی ہر اک طرف سے گھیرے ہوئے ہے گھر کو — جاں تلملا رہی ہے، دل ہو رہے ہیں بیکل
گرنے لگے مکاں جب، کہنے لگے یہ سب — "ہے آج کوچ اپنا ساماں چلا گیا کل"

ہر ہر کھنڈر میں لاشے صدہا پڑے ہوئے ہیں
بلدہ کا ہر محلہ ہے کرب و بلا کا مقتل

واں موجبِ اجل تھی پیاسوں کو تشنہ کامی
یاں باعثِ فنا ہے آبِ بقا کی چھاگل

محشر کا صور پھونکا موسیٰ نے کو بکو ہے
شورِ نشور برپا بلدہ میں سو بہ سو ہے

(۳)

واحسرتا! وہ صدہا گھر بار کا اُجڑنا
ہر نخلِ آرزو کا بنیاد سے اُکھڑنا

وہ نقشۂ اجل کا آنکھوں کے آگے پھرنا
کوہِ قضا کا سر پہ پل بھر میں ٹوٹ پڑنا

دیوار و بام و در کا پانی میں غرق ہونا
سنگیں عمارتوں کا پتوں کی طرح جھڑنا

وہ جسم بے اماں کا موجوں کی نذر ہونا
وہ جانِ ناتواں کا کشتی قضا سے لڑنا

اُس ہاتھ کا نہیں ہے کچھ جس میں جان باقی
بہتے ہوئے درختوں کی ٹہنیاں پکڑنا

ماں سے لپٹ لپٹ کر بچہ کا وہ بلکنا
اور ضعف سے اُس کے سینے پر ایڑیاں رگڑنا

بچہ کا ہاتھ آکر پھر ماں سے چھوٹ جانا
زخمِ جگر کے ٹانکوں کا یک بہ یک اُدھڑنا

سب دل کے ولولوں کو پیوندِ آب کرنا
اک رات کی دلھن کا نوشہ سے یوں بچھڑنا

وہ ڈوبتے ہوؤں کا سب کو سلام کرنا
اور اُن کی حسرتوں کا جا کر دلوں میں گڑنا

تھا فتنۂ قیامت، اے سیلِ رودِ موسیٰ!
مت کر ترا مچلنا، بن کر ترا بگڑنا

شانِ جلالِ باری، قہرِ خدا کا نقشہ
ہر لہر کا بپھرنا، ہر موج کا اکڑنا

کیوں ساتھ ساتھ اپنے لے کر چلا نہ ہم کو
جو قافلہ چلا ہے سر منزلِ عدم کو

مُسدّس

از فصیح الملک جہاں اُستاد نواب مرزا داغ

شہر آشوب

(۱)
فلک زمین و ملائک جناب تھی دِلّی
بہشت و خلد سے بھی اِنتخاب تھی دِلّی
جواب کاہے کو تھا، لاجواب تھی دِلّی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دِلّی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

(۲)
یہ شہر وہ ہے، کہ اِنسان و جان کا دِل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدردان کا دِل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دِل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دِل تھا
رہی نہ آدھی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

(۳)
یہاں کی شام تھی مانندِ صبح نورانی
یہاں کے ذرّے میں تھی مہر کی دُرخشانی
یہاں کے سنگ سے تیرہ تھا لعلِ رُمّانی
یہاں کی خاک سے ہوتا تھا آئنہ پانی
یہ شہر وہ ہے کہ سایہ بھی نُور تھا اس کا
چراغ، رشکِ تجلّی طور تھا اس کا

(۴)
خدا پرستوں کا شیوہ جفا پرستی ہے　　جو مال مست تھے اب اُن کو فاقہ مستی ہے
بجائے ابرِ کرم مُفلسی برستی ہے　　تپنگ جینے سے ہیں ایسی تنگدستی ہے
غضب میں آئی رعیّت بلا میں شہر آیا
یہ یُورپیے نہیں آئے خدا کا قہر آیا

(۵)
عجیب شکل گل و گلستاں نظر آئی　　پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
جب اُٹھ کے تا مژہ خوں چکاں نظر آئی　　تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی
وہ گلرخانِ سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بُلبُلانِ خوش الحاں کے چہچہے نہ رہے

(۶)
فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا　　تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا　　غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا
جلی ہیں دُھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں پتیاں کانٹوں میں جو گلاب کی تھیں

(۷)
زمیں کے حال پہ اب آسماں روتا ہے　　ہر اک فراقِ مکیں میں مکان روتا ہے
گدا و شاہ ضعیف و جوان روتا ہے　　غرض یہاں کے لئے اِک جہان روتا ہے
جو کہیئے جوششِ طوفاں نہیں کہی جاتی
یہاں تو نوحؑ کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

(۸)
برنگِ بُو لے گل اہلِ چمن چمن سے چلے　　غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے

نہ پوچھو زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے
قیامت آئی کہ مُردے نکل کفن سے چلے

مقامِ امن جو ڈھونڈھا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

(۹)
جگہ جگہ تھے زمیندار دار کی صورت
بلا سے کم نہ تھی ہر اک گنوار کی صورت
چڑھے ہی آتے تھے سَر پہ بیجار کی صورت
چھپی نہ اُن سے پرِ اہلِ دیار کی صورت

کسی جگہ جو کوئی ہو کے بے قرار آیا
تو اہلِ قریہ یہ بولے کہ ''لو شکار آیا''

(۱۰)
زباں جو بدلیں تو صورت بدل نہیں آتی
کسی طرح کسی پہلو سے کل نہیں آتی
ملیں جو خاک بھی مُنہ پر تو مل نہیں آتی
پکارتے ہیں اجل کو اجل نہیں آتی

جو سر کو پھوڑیں تو پتھر پرے سرکتے ہیں
جو لوٹیں کانٹوں پہ کانٹے الگ کھٹکتے ہیں

(۱۱)
پیادہ پا ہوں رواں شہسوار صد افسوس
ذلیل و خوار ہوں اہلِ وقار صد افسوس
لہو کے گھونٹ پئیں بادہ خوار صد افسوس
ہزار حیف دلِ بے قرار صد افسوس

جھکے ہیں بارِ الم سے تنے ہوئے کیسے
بگڑ گئے ہیں یکایک بنے ہوئے کیسے

(۱۲)
کہاں تک آہ لکھوں اس کی حالِ بربادی
کسی کو قیدِ محن سے نہیں ہے آزادی
کہاں تک آہ لکھوں آسماں کی جلادی
کہ داغ داغ ہے دل ہر کوئی ہے فریادی

اِلٰہی پھر اِسے آباد و شاد دیکھیں ہم
اِلٰہی پھر اِسے حسبِ مراد دیکھیں ہم

از میر انیسؔ

زندگی میں قدر کرنی چاہیئے

جو زندہ ہے قدر اُس کی کسی کو نہیں زنہار
عبرت کی ہے جا فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار
زندوں سے کچھ اِن مُردہ پسندوں کو نہیں کار
سو جاتا ہے جب وہ، تو یہ سب ہوتے ہیں بیدار
رُوئے تو اُسے کیا، جو ثنا کی تو اُسے کیا
تعریف اگر بعدِ فنا کی تو اُسے کیا

گر زیست میں فاقہ ہو تو غم کوئی نہ کھائے
یوں پیاس میں لاکر کوئی پانی نہ پلائے
اور وقتِ مصیبت میں کوئی پاس نہ آئے
اور بعدِ فنا فاتحہ شربت پہ دلائے
پروا نہیں پیوند ہو گر رختِ بدن میں
مرتے ہیں بس اِس پر کہ تکلف ہو کفن میں

یوں ہاتھ نہ تھامیں، جو گرے بندۂ معبود
یوں جانتے ہیں قرضِ حسن دینے کو بے سود
تابوت کو دینا ہو جو کاندھا تو ہیں موجود
زر صرف ہو میّت کے جو ماتم میں تو خوشنود
یُوں بھُول کے بھی ذکر نہیں کرتے ہیں اُس کا
مرجاتا ہے جب کوئی تو دم بھرتے ہیں اُس کا

رُباعیات

حالی

(۱) ہمّت

تیمور نے اِک مورچہ زیرِ دیوار — دیکھا کہ چڑھا دانے کو لے کر سو بار

آخر سرِ بام لے کے پہونچا تو کہا — مشکل نہیں کوئی بپیشِ ہمّت دشوار

(۲) سختی کا جواب نرمی

فتنہ کو جہاں تک ہو دیجے تسکیں — زہر اُگلے کوئی تو کہیے باتیں شیریں

غُصّہ غُصّے کو اور بھڑکاتا ہے — اِس عارضہ کا علاج بالمثل نہیں

(۳) گدائی کی ترغیب

اِک مرد توانا کو جو سائل پایا — کی میں نے ملامت وہ بہت شرمایا

بولا کہ ہے اِس کا اُن کی گردن پہ وبال — دے دے کے جنھوں نے مانگنا سکھلایا

(۴) کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لئے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح

بنتی نہیں زندگی میں بے کام کیے
مُردوں کی طرح جیے تو کیا خاک جیے

(۵) جھوٹی نمائش

ہیں جھوٹ کے سچ میں سب سمونے والے
گھڑیاں رہتی ہیں جن کی جیبوں میں مدام

بننے والوں سے کم ہیں ہونے والے
اکثر ہیں وہی وقت کے کھونے والے

(۶) اسراف

مسرف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں
گر مُنجل پہ لوگ اُن کے ہنسیں بہتر ہے

نعمت نہ خدا کی رائگاں یوں کھوئیں
اس سے کہ فضولیوں پہ اُن کی روئیں

میر انیس

خدا کی عطا

آدم کو عجب خدا نے رتبہ بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایماں

ادنیٰ کے لئے مقامِ اعلیٰ بخشا
اس ایک کفِ خاک کو کیا کیا بخشا

سامان آخرت

گر لاکھ برس جیے تو پھر مرنا ہے
ہاں! توشۂ آخرت مہیا کرلے

پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
غافل! تجھے دُنیا سے سفر کرنا ہے

از مؤلّف

نیچر پر انسان کی حکومت

فطرت کے مطابق اگر انسان لے کام
مٹّی۔ پانی۔ ہوا۔ حرارت۔ بجلی

حیوان تو حیوان جمادات ہوں رام
دانشمندوں کے ہیں مطیعِ احکام

کسی کا کام اور کسی پر الزام

شیطان کب کرتا ہے کسی کو گمراہ
سب کام کسی کا اور کسی پر الزام

اس راز سے ہے خدائے غالب آگاہ
لاحَولَ وَ لاَ قُوَّۃَ اِلاَّ بِاللہ

حواشی از مؤلف

اقسامِ نظم

مصرعہ۔ ایک موزوں جملہ
شعر۔ دو ہم وزن مصرعے۔
فرد۔ اکیلا شعر۔ دونوں مصرعوں میں قافیہ ہو یا ایک میں۔
بیت۔ مثلِ شعر مگر بیت اور شعر عام ہیں فرد سے۔
رباعی۔ چار مصرعوں کی یا دو بیت کی ہوتی ہے اُس کا پہلا دوسرا اور تیسرا مصرعہ ضرور ہم قافیہ ہوتا ہے اور جائز ہے کہ چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں رباعی کا وزن خاص ہے اور تھوڑے تھوڑے اختلاف سے اُس کے چوبیس [۲۴] وزن ہو جاتے ہیں۔
غزل۔ صورت کے لحاظ سے چند بیتوں کا مجموعہ ہے جو وزن قافیہ میں یکساں ہوں اول بیت کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور باقی بیتوں کے اخیر مصرعے، اول بیت کو مطلع کہتے ہیں اور جائز ہے کہ ایک غزل میں چند مطلعے ہوں۔ غزل کا اخیر شعر مقطع کہلاتا ہے اور دستور ہے کہ مقطع میں شاعر اپنا تخلّص بھی درج کرتا ہے لیکن قدمائے فارس میں اور نیز شعرائے عرب میں یہ دستور نہ تھا۔ ابیات غزل کی تعداد قدما کے ہاں سات سے بارہ [۱۲] تیرہ [۱۳] تک ہوتی تھی مگر متاخرین نے پچیس [۲۵] تک بڑھا دی ہے۔ معنی کے لحاظ سے غزل کا ہر شعر جداگانہ مضمون کا ہوتا ہے شاذ و نادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کُل غزل ایک ہی مضمون کی ہو۔ غزل موضوع تو اسی غرض سے ہوئی تھی کہ اس میں محض عاشقانہ مضمون ہوں مگر تصوف، پند و حکمت، ظرافت وغیرہ اور مضامین بھی داخل ہو گئے ہیں۔

قصیدہ۔ صورت میں مثل غزل کے ہوتا ہے البتہ تعداد ابیات مقرر نہیں لیکن اکثر سو ڈیڑھ سو بیت تک ہوتا ہے معنی کے لحاظ سے قصیدہ میں ایک مسلسل مضمون ہوتا ہے کسی کی مدح ہو یا مذمت یا نصائح ہوں یا شکایت زمانہ ہو یا کوئی واقعہ ہو قصیدہ کے شروع میں چند ابیات تمہید' لکھتے ہیں اُس کو تشبیب کہتے ہیں اور جہاں سے اصل مقصد کی طرف شاعر رجوع کرتا ہے وہ مقام تخلص کہلاتا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ قصیدہ میں تشبیب نہ ہو یعنی شروع ہی سے اصل مطلب لکھا جائے

قطعہ۔ صورت میں مثل قصیدہ ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ قطعہ میں مطلع نہیں ہوتا اور مضمون قطعہ کا مسلسل و مربوط ہونا چاہیئے۔

مثنوی۔ صورت اس کی یہ ہے کہ چند بیتیں ایک وزن کی ہوں مگر ہر بیت کا قافیہ جُدا گانہ اور مضمون کے لحاظ سے مربوط و مُسلسل ہو۔

مسمّط۔ صورت اُس کی یہ ہے کہ دُو دُو یا تین تین یا چار چار ہم وزن و ہم قافیہ مصرعوں کے بعد ایک مصرعہ اُسی وزن کا لائیں مگر قافیہ میں مختلف ہو تو اس صورت میں اقسام ذیل پیدا ہوتی ہیں۔

مثلّث۔ جس کا ہر بند تین مصرعہ کا ہو اور تیسرا ہر جگہ یکساں قافیہ رکھتا ہو۔

مُربّع۔ جس کا ہر بند چار مصرعہ کا ہو اور چوتھا ہر جگہ یکساں قافیہ رکھتا ہو۔

مُخمّس۔ جس کا ہر بند پانچ مصرعہ کا ہو اور پانچواں ہر جگہ یکساں قافیہ رکھتا ہو۔

ترجیع بند۔ وہ ہے کہ چند ابیات مثل صورت غزل لکھ کر اُس کے ساتھ مطلع غیر قافیہ کا تضمین کریں اگر بند کا مطلع بار بار آتا ہو تو ترجیع بند کہلاتا ہے، اور اگر بند کا مطلع ہر جگہ مختلف ہو تو ترکیب بند کہتے ہیں۔ اسی کی اقسام یہ ہیں۔

مسدّس۔ چار مصرعے ہم قافیہ پھر ایک مطلع یہ ایک بند ہوا۔ اسی طرح ہر بند ہو مگر مطلع غیر مکرّر

مثمّن ۔ چھ مصرعے ہم قافیہ پھر ایک مطلع غیر مکرّر۔

مرثیہ ۔ کسی قسم کی نظم جس میں کسی کی موت پر افسوس و ماتم ہو۔

تاریخ ۔ کسی قسم کی نظم جس میں کسی واقعہ کا سن و سال اعداد مقررہ حروف سے ظاہر کیا گیا ہو۔ جن الفاظ سے سال نکلتا ہے وہ مادۂ تاریخ کہلاتا ہے۔

مختصر حالات شعرا از مؤلف

نواب مرزا خاں داغ

مولد و منشا ان کا شہر دہلی۔ استاد ذوق کے ارشد تلامذہ سے تھے فی زمانا ان کی استادی کا آوازہ چار دانگ ہند میں بلند ہے ایک عرصہ تک نواب کلب علی خاں مغفور کی قدردانی سے رام پور میں رہے۔ پھر نظام دکن کی سرکار میں صاحب منصب اور خطاب "جہاں استاد" سے معزز و مؤقر ہیں ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا ان کا کلام روزمرہ اُردو کی جان ۔ محاورات کی کان ۔ برجستگی شوخی شگفتگی ۔ اور دلنشینی میں بے نظیر ہے مگر عشقیہ مضامین کے علاوہ اور مضمون شاذ ہوتے ہیں۔

منشی امیر احمد امیر مینائی

منشی امیر احمد لکھنوی ۔ امیر تخلص علم و فضل میں دستگاہ عالی رکھتے تھے فن سخن میں سید مظفر علی خاں اسیر کے شاگرد رشید تھے ۔ مدّت العمر ریاست رام پور میں باعزاز و اکرام رہے آخر ایام میں حیدر آباد دکن گئے اور وہیں رہگرائے عالم باقی ہوئے زمانۂ حال کے مشہور و مسلّم استاد تھے،

سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر

سراج الدین محمد نام بہادر شاہ لقب ظفر تخلص۔ آخری جانشین شاہان مغلیہ شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے اُن کا کلام نہایت سادہ سلیس اور روزمرّہ اردو کا عمدہ نمونہ ہے اور اُس میں زیادہ تر ذوق کا کلام ہے۔

شیخ ابراہیم ذوق

شیخ ابراہیم نام تھا۔ ذوق تخلص دلّی کے ایک غریب سپاہی زادہ تھے۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف میلان تھا۔ ابتدا میں شاہ نصیر کا تلمذ اختیار کیا۔ مگر پھر مدِّ مقابل بن گئے۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کو "ملک الشعرا خاقانی ہند" خطاب دیا بہادر شاہ کے اُستاد تھے سنہ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے ۶۸ برس کے ہو کر سنہ ۱۲۷۱ھ میں عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے ان کا کلام زیادہ تر سودا کی طرز پر ہے۔ مگر محاورات اور ضرب المثل کو خوب باندھتے ہیں قصیدہ گوئی میں سودا کے بعد ان سے زیادہ کسی نے شہرت نہیں پائی۔

سوز

مولوی عبدالکریم نام تھا۔ اور سوز تخلص مولانا صہبائی دہلوی کے فرزند اصغر تھے۔ فن سخن میں طبع رسا رکھتے تھے۔ اگر زندہ رہتے تو علم اُستادی بلند کرتے۔ عالم جوانی تھا کہ ہنگامہ غدر سنہ ۱۸۵۷ء میں مقتول ہوئے۔

حکیم مومن خاں مومن

مومن خاں نام مومن تخلص وطن دہلی طبابت پیشہ آبائی سنہ ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۲۶۸ھ میں رحلت کی نہایت ذکی و ذہین آدمی تھے اُن کی روش خاص معاملہ بندی ہے کہیں میر درد کی سی سادہ بیانی کہیں باریکی معانی ذوق و غالب کے ہمعصر تھے

میرزا اسد اللہ خاں غالب

اسد اللہ خاں نام تھا مرزا نوشہ عرف چندے اسدؔ تخلص کیا پھر غالبؔ۔ سرکارِ شاہی سے نجم الدولہ دبیر الملک خطاب بلا صل ونسل میں ترک تورانی تھے۔ پرورش آگرہ میں پائی۔ مگر دلّی میں شادی ہوئی۔ اِس لئے وہیں کی سکونت اختیار کی ۷۳ برس کے ہو کر ۱۸۶۹ء میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے مرزا صاحب کو فارسی گوئی میں زیادہ توغل تھا اِن کا ابتدائی ریختہ بھی بالکل فارسی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے ؎

وہ جو کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

پھر خیالات کی بلندی اور دقّتِ مضمون نے اُس کو فہمِ عام سے اور بھی بالاتر بنا دیا چنانچہ لوگوں کی شکایت کے جواب میں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صِلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آخر میں دوستوں کی صلاح سے صاف گوئی و سادہ بیانی اختیار کر لی تھی۔ بہر کیف ان کا کلام بلاغت و متانت کا عمدہ نمونہ ہے معانیٔ کثیر کو الفاظِ قلیل میں بڑے لطف سے ادا کرتے ہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ

امام بخش نام تھا اور ناسخ تخلص اِن کا باپ برسمِ تجارت لاہور سے فیض آباد اودھ میں آیا وہیں یہ پیدا ہوئے لکھنؤ میں تربیت پائی۔ میر تقی۔ مصحفی۔ انشا اور جرأت کا اخیر زمانہ شیخ نے دیکھا تھا خواجہ آتش سے مدّتوں مشاعرہ و مطارحہ رہا ۱۲۵۴ھ میں انتقال کیا۔ ۶۴-۶۵ برس کی عمر پائی اور بقول بعض قریب ستّر کے خاص شمال سے عام نتیجہ نکالنا

اور ہر مضمون کو تشبیہ و تمثیل میں ادا کرنا
ان کی طرز خاص ہے۔ ترکیب چست
اور بندش الفاظ متین الا محاورات کی
خوبی اور تاثیر و دل آویزی بہت کم۔
ان کی شاعری اقسام نظم میں سے صرف
غزل گوئی پر محدود ہے۔

خواجہ حیدر علی آتش

حیدر علی نام تھا اور آتش تخلص ان
کے والد دلی سے ترک وطن کر کے لکھنؤ
میں جا رہے تھے۔ خواجہ کو ابتدائے عمر
ہی سے شاعری کا چسکا لگا شیخ مصحفی کے
شاگرد ہوئے اور غزل گوئی میں شہرت پائی
شیخ ناسخ سے مقابلہ رہا چنانچہ ہم طرح
غزلیں دونوں کے دیوانوں میں موجود ہیں
محاورہ بندی اور روزمرہ کا اتباع ان کے
کلام میں زیادہ ہے بشتیر پر تاثیر و دلآویز ہے
تاریخ ولادت و وفات معلوم نہیں
مگر اتنا معلوم ہے کہ شیخ ناسخ کے بعد تک
زندہ رہے۔

میر ببر علی انیس

میر ببر علی نام انیس تخلص میر حسن دہلوی کے
نامور پوتے لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی
مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی ان کی چار دانگ
ہند میں مشہور و مسلم تھی۔ سلاست بیان
اور لطافت محاورہ میں ان کا کلام اس
پایۂ بلند پر پہونچا ہے کہ جس کی نظیر نہیں۔

میر نظام الدین ممنون

میر نظام الدین نام تھا اور ممنون تخلص فخر الشعرا
خطاب۔ میر قمر الدین منت ملک الشعرا کے
فرزند رشید تھے وطن قصبۂ سونی پت تھا
اور مسکن شہر دہلی اپنے عہد کے مشہور
استاد تھے اور ایک طرز خاص کے موجد
ان کے کلام میں فارسیت کا رنگ غالب

ہے اور اکثر مشکل کہتے تھے میر و سودا
کا زمانہ دیکھے ہوئے تھے بہ عمر پیرانہ سالی
سنہ ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی۔

سید انشاء اللہ خاں انشا

انشاء اللہ خاں نام انشا تخلص شرفائے
دہلی سے تھے۔ استعداد علمی میں لائق و فائق
فارسی۔ عربی۔ ترکی سے ماہر۔ شیخ مصحفی
نے ان کو "فیضی زماں" لکھا ہے کلام میں
ہزل و ظرافت زیادہ ہے۔ مگر جو صاف
اور سنجیدہ ہے وہ بے مثل و نظیر ہے میر
مصحفی و جرأت کے ہمعصر تھے۔ نواب آصف الدولہ
کے عہد میں لکھنؤ پہونچے سنہ ۱۲۳۳ھ میں
بحالت دیوانگی انتقال کیا

میر حسن

میر غلام حسن نام حسن تخلص شرفائے دہلی
سے تھے۔ فن سخن میں میر درد اور میرزا
سودا سے مشورہ کرتے تھے۔ ایام شباب
میں دہلی سے فیض آباد آئے پھر لکھنؤ،
وہیں یہ مثنوی لکھی۔ جس سے بہتر اُردو
میں کوئی مثنوی نہیں ہوئی بیان سادہ
پر تاثیر اور محاورہ کی خوبیوں سے معمور
جس معاملہ کو بیان کیا ہے اُس کی تصویر
کھینچ دی ہے۔

میرزا سودا

مرزا محمد رفیع نام تھا۔ اور سودا تخلص
سنہ ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ دلی ان کا
مولد و منشا ہے۔ فن سخن میں شاہ حاتم
کے شاگرد تھے۔ زمانۂ شاہ عالم میں۔ ان کی
شاعری کا آوازہ بلند ہوا۔ میرزا مظہر
جان جاناں۔ میر درد۔ اور میر تقی کے ہمعصر
تھے۔ اُن کا کلام نہایت پُر زور ہے

کہیں تشبیہ و استعارہ کی رنگ آمیزی
کہیں تراکیب فارسی کا زور و شور ہجویں
اور قصیدے مرزا کے اور غزل میر کی مشہور
ہے غرض دونوں صاحب ریختہ کے استاد
مسلّم ہیں چنانچہ مصحفی کہتے ہیں ؎

حسد کی جا نہیں اے مصحفی کلام ان کا
کہ اپنے عہد کے مرزا و میر ہم بھی ہیں

مرزا ۱۱۹۵ھ میں لکھنؤ چلے گئے اور وہیں
ستّر برس کی عمر میں انتقال کیا۔

میر تقی میر

محمد تقی نام تھا اور میر تخلص۔ مولد و ماوا
اکبرآباد اور وطن ثانی دہلی۔ یہاں آکر
ان کی شاعری نے شہرت پائی۔ آخر عمر
میں لکھنؤ چلے گئے اور باقی ایام وہیں
بسر کیے چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھ کو لیک
یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزم سفر ہنوز

سنہ ۱۲۲۵ھ میں بہ عہد نواب آصف الدولہ
جب کہ ان کی عمر قریب سو برس کے ہو گئی
تھی رہگرائے عالم باقی ہوئے۔ مرزا رفیع السودا
کے معاصر تھے۔ میر صاحب کے کلام کی
سلاست و صفائی سوز و گداز محاورات کی
خوبی اور معاملہ بندی آج تک مانی جاتی ہے

WORKS BY THE SAME AUTHOR.

	Rs.	A.	P.
Urdu Primer	0	0	9
Urdu Reader I	0	1	6
Do. II	0	3	0
Do. III	0	4	0
Do. IV	0	4	6
Do. V	0	5	3
Tuzuk-i-Urdu (enlarged edition) ...	1	8	0
Do. (old edition)	0	9	6
Safeena-i-Urdu	0	8	0
Kumak-i-Urdu	0	6	0
Kulliat-i-Ismail (bound)	2	6	0
Do. (unbound)	2	0	0
Turjuman-i-Farsi	0	2	6
Urdu Grammar, Part I	0	1	9
Do. Part II	0	3	3
Sawad Urdu	0	4	3

PRINTED AND PUBLISHED BY K. D. SETH,

AT THE NEWUL KISHORE PRESS,

Hazratganj, Lucknow.